قوم یونس علیہ السلام کا انجام

اب ہم حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر چھوڑتے ہیں اور ان کی قوم کا حال بیان کرتے ہیں۔

جب حضرت یونس علیہ السلام نے غیض وغضب کی حالت میں اپنی قوم کو چھوڑ دیا اور خدا کے غضب کے آثار بھی اس پر ظاہر ہو گئے۔ تو وہ لوگ شدت کے ساتھ لرز اٹھے،

اب انہیں ہوش آیا، ایک عالم کہ جوان کے درمیان رہتا تھا وہ اس کے گرد جمع ہو گئے اور اس کی رہبری اور ہدایت سے توبہ پر آمادہ ہو گئے۔

بعض روایات میں ہے کہ وہ سب مل کر بیابان کی طرف چل پڑے اور عورتوں اور بچوں نیز جانوروں اور ان کے بچوں کے درمیان جدائی ڈال دی، پھر گریہ وزاری میں مشغول ہو گئے اور نالہ وفریاد کی صدا بلند کی، اور خلوص کے ساتھ اپنے گناہوں اور ان کو تاہیوں پر توبہ کی کہ جو انھوں نے خدا کے پیغمبر حضرت یونس علیہ السلام کے ساتھ روا رکھی تھیں۔

اس موقع پر عذاب کے پردے ہٹ گئے اور وہ حادثہ پہاڑوں پر جا گرا، اور توبہ کرنے والے اہل ایمان نے لطف الٰہی کے باعث نجات پائی۔

حضرت یونس علیہ السلام اس ماجرے کے بعد اپنی قوم کے پاس آئے تا کہ دیکھیں کہ عذاب سے ان پر کیا گزری۔

جب وہ آئے تو بہت متعجب ہوئے کہ گویا دنیا بدل گئی، وہ ان کی ہجرت کے وقت سب کے سب بت پرست تھے لیکن اب وہ سب کے سب خدا پرست مؤحد بن گئے ہیں۔

قرآن اس موقع پر کہتا ہے: ہم نے اسے ایک لاکھ یا اس سے کچھ زیادہ افراد کی طرف بھیجا۔[1]

وہ ایمان لے آئے اور ہم نے انہیں معین مدت تک دنیاوی نعمتوں اور زندگی سے بہرہ مند کیا۔[2]

البتہ ان کا اجمالی ایمان اور توبہ تو پہلے ہو چکی تھی لیکن خدا اور اس کے پیغمبر حضرت یونس علیہ السلام اور ان کی تعلیمات واحکام پر تفصیلی ایمان اس وقت صورت پذیر ہوا جب جناب یونس علیہ السلام ان کے درمیان پلٹ کر آئے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ آیات قرانی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ماموریت نئے سرے سے اسی قوم کی طرف ہوئی تھی اور یہ جو بعض نے ان کی جدید ماموریت کو ایک نئی قوم کے لئے سمجھا ہے وہ ظاہر قرآن کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔

یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں کیسے زندہ رہے؟

بیان کر چکے ہیں کہ ہمارے پاس کوئی واضح دلیل نہیں ہے کہ یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں کتنی مدت رہے؟ چند گھنٹے یا چند دن یا چند ہفتے؟ بعض روایات میں نو گھنٹے، بعض میں تین دن اور بعض میں اس سے زیادہ، یہاں تک کہ چالیس دن تک کی مدت بیان کی گئی ہے، لیکن ان اقوال کا کوئی یقینی ثبوت موجود نہیں ہے، صرف تفسیر علی بن ابراہیم میں امیر المومنین علیہ السلام سے ایک حدیث میں حضرت یونس علیہ السلام کا مچھلی کے پیٹ میں توقف 9 گھنٹے بیان ہوا ہے۔ بعض مفسرین اہل سنت نے اس کی مدت ایک گھنٹہ بھی بیان کی ہے۔

---

[1] سورہ صافات آیت 147

[2] سورہ صافات آیت 148

لیکن جو کچھ بھی ہو بلا شک وشبہ یہ توقف ایک غیر معمولی امر ہے انسان ایسے ماحول میں جہاں ہوا نہ ہو چند منٹ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا، اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بچہ ماں کے پیٹ میں کئی ماہ تک زندہ ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک اس کے تنفس کی مشینری نے اپنا کام کرنا شروع نہیں کیا ہوتا ہے اور وہ ضروری آکسیجن صرف ماں کے خون کے راستے سے حاصل کرتا ہے۔

اس بنا پر حضرت یونس علیہ السلام کا ماجرا بلا شبہ ایک اعجاز ہے اور یہ پہلا اعجاز نہیں ہے جو ہمیں قرآن سے معلوم ہوا ہے، وہی خدا جس نے ابراہیم علیہ السلام کو آگ کے درمیان سالم رکھا، اور موسیٰ علیہ السلام و بنی اسرائیل کو دریا کے وسط میں خشک راستے بنا کر غرق ہونے سے بچایا، اور نوح علیہ السلام کو ایک سادہ اور عام کشتی کے ذریعے اس عظیم اور وسیع طوفان سے نجات بخشی اور صحیح وسالم زمین پر اتارا، وہی خدا یہ قدرت بھی رکھتا ہے کہ اپنے مخصوص بندوں میں سے ایک بندے کو بہت بڑی مچھلی کے پیٹ میں صحیح وسالم رکھے۔

البتہ گزشتہ اور موجودہ زمانے میں اس قسم کی بڑی مچھلیوں کا موجود ہونا کوئی عجیب بات نہیں ہے، اس وقت بھی بڑی مچھلیاں ''وہیل'' نام کی موجود ہیں، جس کی لمبائی 20 میٹر سے بھی زیادہ ہوتی ہے اور یہ اس زمین کا سب سے بڑا جانور ہے اور اس کا جگر ایک ٹن تک ہوتا ہے۔

حضرت الیاس علیہ السلام

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ حضرت الیاس علیہ السلام خدا کے عظیم انبیاء میں سے ایک ہیں اور قرآنی آیات نے یہ مسئلہ صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ''الیاس خدا کے رسولوں میں سے تھے''۔[1]

اس پیغمبر کا نام قرآن مجید کی دو آیات میں آیا ہے ایک تو سورہ صافات میں اور دوسرا سورہ انعام میں چند انبیاء کے ساتھ۔

لیکن اس بارے میں کہ قرآن میں جن انبیاء کا نام آیا ہے انہی میں سے ایک پیغمبر کا نام الیاس ہے یا یہ کسی پیغمبر کا مستقل نام ہے نیز اس کی خصوصیات کیا ہیں؟ اس ضمن میں مفسرین میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں، ان کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

الف:۔ بعض کہتے ہیں کہ ''الیاس''، ''ادریس'' کا دوسرا نام ہے (کیونکہ ادریس کا دوسرا نام ''ادراس'' بھی تلفظ ہوا ہے اور وہ مختصر سی تبدیلی کے ساتھ الیاس ہو گیا)۔

ب:۔ بعض کا کہنا ہے کہ الیاس بنی اسرائیل کے پیغمبروں میں سے ہیں ''یاسین'' کے فرزند ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہارون کے نواسوں میں سے ہیں۔

ج:۔ کچھ کا یہ بھی کہنا ہے کہ الیاس خضر کا دوسرا نام ہے جب کہ بعض دوسروں کا کہنا ہے کہ الیاس خضر کے دوستوں میں سے ہیں اور دونوں زندہ ہیں اس فرق کے ساتھ کہ الیاس تو خشکی پر مامور ہیں لیکن خضر جزیروں اور دریاوں پر مامور ہیں، بعض دوسرے الیاس کی ماموریت بیابانوں میں اور خضر کی ماموریت پہاڑوں پر خیال کرتے ہیں اور دونوں کے لئے عمر جاودانی کے قائل ہیں، بعض الیاس کو ''الیسع'' کا فرزند سمجھتے ہیں۔

د:۔ بعض کہتے ہیں کہ الیاس بنی اسرائیل کے وہی ''ایلیا'' پیغمبر ہیں جو ''اجاب'' بادشاہ بنی اسرائیل کے ہم عصر تھے جنھیں لوگوں نے ''یہ'' بھی جانا ہے جو مسیح کے تعمید دہندہ تھے۔

لیکن قرآن کی آیات کے ظاہر کے ساتھ جو بات ہم آہنگ ہے وہ یہ ہے کہ یہ لفظ مستقلاً ایک پیغمبر کا نام ہے اور قرآن میں

---

[1] سورہ صافات آیت 123

جن دیگر پیغمبروں کے نام آئے ہیں یہ ان کے علاوہ ہیں جو ایک بت پرست قوم کی ہدایت کے لئے مامور ہوئے تھے اور اس قوم کی اکثریت ان کی تکذیب کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی لیکن مخلص مومنین کے ایک گروہ نے ان کی پیروی کی۔

بعض اس بات پر توجہ کرتے ہوئے کہ اس قوم کے بڑے بت کا نام ''بعل'' تھا یہ نظریہ رکھتے تھے کہ یہ پیغمبر سرزمین ''شامات'' میں مبعوث ہوئے تھے اور ان کی فعالیت کا مرکز شہر ''بعلبک'' تھا جو اس وقت لبنان کا حصہ ہے اور شام کی سرحد پر واقع ہے۔

بہرحال اس پیغمبر کے بارے میں مختلف داستانیں کتابوں میں بیان کی گئی ہیں اور چونکہ وہ قابل اعتماد و اطمینان نہیں لہٰذا ہم نے انہیں نقل نہیں کیا۔

پیغمبر خدا مشرکین کے مقابلے میں

قرآن میں جناب الیاس علیہ السلام کے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس وقت کو یاد کرو جب اس نے قوم کو خبردار کیا اور کہا: ''کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے''؟[1]

آگے چل کر قرآن میں اس مسئلہ کے بارے میں، اس سے بھی زیادہ صراحت کے ساتھ بیان فرماتا ہے: ''کیا تم'' بعل ''بت کو پکارتے ہو اور بہترین خالق کو چھوڑ رہے ہو''۔[2]

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کا ایک معروف بت تھا، جس کا نام ''بعل'' تھا۔

اور وہ اس کے سامنے سجدہ کیا کرتے تھے حضرت الیاس علیہ السلام نے انہیں اس قبیح عمل سے روکا اور عظیم آفریدگار عالم اور توحید خالص کی طرف دعوت دی۔

اسی وجہ سے ایک جماعت کا نظریہ ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام کی فعالیت کا مرکز ''شامات'' کے شہروں میں سے شہر ''بعلبک'' تھا۔

کیونکہ ''بعل'' اس مخصوص بت کا نام تھا اور ''بک'' کا معنی ہے شہر۔

ان دونوں کی آپس میں ترکیب سے ''بعلبک'' ہو گیا، کہتے ہیں کہ سونے کا اتنا بڑا بت تھا کہ اس کا طول بیس ہاتھ تھا، اس کے چار چہرے تھے اور اس بت کے چار سو سے زیادہ خادم تھے

البتہ بعض کسی معین بت کو ''بعل'' نہیں سمجھتے بلکہ بت کے مطلق معنی میں لیتے ہیں مگر بعض دوسرے اسے ''رب اور معبود'' کے معنی میں سمجھتے ہیں۔

بہرحال الیاس علیہ السلام نے اس بت پرست قوم کی سخت مذمت کی اور مزید کہا: ''اس خدا کو چھوڑ رہے ہو جو تمہارا اور تمہارے گزشتہ آباواجداد کا پروردگار ہے۔''[3]

تم سب کا مالک و مربی وہی تھا اور ہے، اور جو نعمت بھی تمہارے پاس ہے وہ اسی کی طرف سے ہے اور ہر مشکل کا حل اسی کے دست قدرت سے ہوتا ہے،

اس کے علاوہ نہ تو خیر و برکت کا کوئی اور سرچشمہ موجود ہے اور نہ ہی شر و آفت کا کوئی اور دفع کرنے والا ہے۔

---

[1] سورہ صافات آیت 124

[2] صافات آیت 125

[3] سورہ صافات 126

قوم الیاس علیہ السلام کا ردعمل

لیکن اس سرپھری اور خود پسند قوم نے خدا کے اس عظیم پیغمبر کے استدلالی پند و نصائح اور واضح ہدایات پر کان نہ دھرے اور ''اس کی تکذیب کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے''۔[1]

خدا نے بھی ان کی سزا کو ایک مختصر سے جملے میں بیان کرتے ہوئے کہہ دیا'': وہ بارگاہ عدل الٰہی اور اس کی دوزخ کے عذاب میں حاضر کئے جائیں گے۔''[2] اور اپنے قبیح اور بداعمال کی سزا کا مزا چکھیں گے۔لیکن ظاہر ہوتا ہے کہ چھوٹا سا نیک، پاک اور مخلص گروہ حضرت الیاس علیہ السلام پر ایمان لے آیا تھا لہٰذا ان کا حق فراموش نہ کرتے ہوئے بلا فاصلہ فرمایا گیا ہے:''مگر خدا کے مخلص بندے۔''[3]

قرآن اس واقعہ کے آخر میں فرماتا ہے:''ہم نے الیاس کا نیک نام بعد والی امتوں میں جاوداں کر دیا۔''[4] دوسرے مرحلے میں قرآن مزید کہتا ہے:''الیاسین پر سلام و درود ہو۔''[5]

تیسرے مرحلے میں فرمایا گیا ہے:''ہم نیکوں کاروں کو اسی طرح سے بدلہ دیا کرتے ہیں۔''[6]

چوتھے مرحلے میں ان تمام باتوں کی اصل بنیادی یعنی ایمان کا ذکر ہے:''یقیناً وہ (الیاس) ہمارے مومن بندوں میں سے ہے''[7]

''ایمان'' و''عبودیت'' احسان کا سرچشمہ ہے اور احسان مخلصین کی صف میں شامل ہونے اور خدا کے سلام کا حقدار ہونے کا سبب ہے۔

حضرت الیسع علیہ السلام

''الیسع'' جن کا نام صرف دو مرتبہ قرآن میں آیا ہے۔[8]

قرآن کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ بھی خدا کے بزرگ پیغمبروں میں سے تھے اور ان بزرگوں میں سے تھے جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔''ہم نے ان میں سے ہر ایک کو عالمین پر برتری و فضیلت بخشی۔''[9]

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ بنی اسرائیل کے مشہور پیغمبر ''یوشع بن نون'' ہیں جن پر ''الف ولام'' داخل ہوا ہے اور اس کا

---

[1] سورہ صافات 127

[2] سورہ صافات 127

[3] سورہ صافات 128

[4] سورہ صافات 129

[5] سورہ صافات 130

''الیاس'' کی جگہ ''الیاسین'' آنا اس وجہ سے ہے کہ الیاسین بھی الیاس کے ہم معنی ہیں یا الیاس اور ان کے پیروکاروں کے لئے آیا ہے۔

[6] سورہ صافات 131

[7] سورہ صافات 132

[8] سورہ ص آیت 48

[9] سورہ انعام آیت 86

''شین''،''سین'' سے بدل گیا ہے اور کسی غیر عربی کے نام پر یہ عبری نام ہے، الف و لام کا داخل ہونا کوئی نئی چیز نہیں ہے، جس طرح سے کہ عرب ''اسکندر'' کو ''الاسکندر'' کے نام سے پہچانتے ہیں۔

جب کہ بعض دوسرے اسے ایک عربی لفظ سمجھتے ہیں جو "یسع" (مادہ ''وسعت''، فعل مضارع) سے لیا گیا ہے اور اسی پہلو اختیار کرنے کے بعد الف والام جو مشخصات اسم میں سے ہے اس پر آگیا ہے۔

سورہ انعام کی آیت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ اولاد ابراہیم علیہ السلام میں سے تھے لیکن یہ واضح نہیں کرتی کہ آیا وہ بنی اسرائیل میں سے تھے یا نہیں؟ توریت کی کتاب ''بادشاہان'' میں ان کا نام ''الیشع'' بن ''شافات'' لکھا ہوا ہے اور عبرانی زبان میں الیشع کا معنی ''ناجی'' اور ''شافات'' کا معنی ''قاضی'' ہے۔

بعض اسے اور ''خضر علیہ السلام'' کو ایک ہی سمجھتے ہیں لیکن اس سلسلے میں کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے اور یہ جو بعض اسے ''ذالکفل'' ہی سمجھتے ہیں تو یہ قرآن کے صریح برخلاف ہے کیونکہ قرآن نے ذالکفل کا ''الیسع'' پر عطف کیا ہے۔ بہرحال وہ ایک بلند مقام اور پر استقامت پیغمبر ہیں اور ان کی زندگی سے سبق حاصل کرنے کے لئے ہمارے لئے یہی کافی ہے۔

حضرت ذَالکفل علیہ السلام

مشہور یہی ہے کہ وہ پیغمبروں میں سے تھے اور ان کے نام کا سورہ انبیاء کی آیت 85 میں پیغمبروں کے ناموں کے ساتھ اسماعیل علیہ السلام اور ادریس علیہ السلام کے بعد ذکر اس معنی پر گواہ ہے۔

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے پیغمبروں میں سے تھے، وہ انہیں ایوب علیہ السلام کا فرزند سمجھتے ہیں جس کا اصلی نام ''بشر'' یا ''شرف'' تھا، بعض انہیں ''حزقیل'' سمجھتے ہیں کہ ذالکفل ان کے لقب کے طور پر مشہور ہوگیا ہے۔

انہیں ذالکفل کا نام کیوں دیا گیا ہے؟ اس بارے میں اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ''کفل'' نصیب اور حصہ کے معنی میں بھی آیا ہے اور کفالت وعہدہ داری کے معنی میں بھی علماء نے مختلف احتمال ذکر کئے ہیں۔

کبھی تو یہ کہا ہے کہ چونکہ انھوں نے یہ عہد کیا ہے کہ راتوں کو عبادت کے لئے اٹھیں گے اور دن میں روزہ رکھا کریں گے اور قضاوت اور فیصلہ کرتے وقت ہرگز غصے میں نہ آئیں گے اور وہ اپنے اس عہد و پیمان پر قائم رہے لہٰذا انہیں یہ لقب دیا گیا۔

کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چونکہ انھوں نے بنی اسرائیل کے انبیاء کے ایک گروہ کی کفالت کی تھی اور وقت کے ظالم بادشاہ سے ان کی جان بچائی تھی اس لئے انہیں یہ نام دیا گیا ہے۔

بہرحال ان کی زندگی کے حالات کی اتنی ہی مقدار جو آج ہماری دسترس میں ہے، خدا کی اطاعت و بندگی اور ظالموں کے مقابلے میں ان کی استقامت پامردی کی دلیل ہے اور ہمارے آج اور کل کے لئے ایک سبق ہے۔ اگرچہ ان کی زندگی کی تفصیلات کے بارے میں زمانے کی دوری کے سبب دقیق طور پر فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت عزیر علیہ السلام

یہ گفتگو ایک نبی کی ہے جو اثنا سفر ایک سواری پر سوار تھا، کھانے پینے کا کچھ سامان اس کے ہمراہ تھا اور وہ ایک آبادی میں سے گزر رہا تھا جو وحشت ناک حالت میں گری پڑی تھی اور ویران ہوچکی تھی اور اس کے باسیوں کے جسم اور بوسیدہ ہڈیاں نظر آرہی

تھیں، جب اس نے یہ وحشت ناک منظر دیکھا تو کہنے لگا: ''خدا ان مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا''۔ البتہ اس کی یہ بات شک اور انکار کے طور پر نہ تھی بلکہ از روئے تعجب تھی کیونکہ قرآن میں موجود قرائن نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ ایک نبی تھے، جیسا کہ خدا نے اس سے گفتگو کی، روایات بھی اس حقیقت کی تائید کرتی ہیں جس کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔

خداوند عالم نے اسی وقت اس کی روح قبض کر لی اور پھر ایک سو سال بعد اسے زندہ کیا، اب اس سے سوال کیا کہ اس بیابان میں کتنی دیر ٹھہرے رہے ہو؟ وہ تو یہ خیال کرتا تھا کہ یہاں تھوڑی دیر ہی توقف کیا ہے، فوراً جواب عرض کیا: ایک دن یا اس سے بھی کم۔ اسے خطاب ہوا: تم ایک سو سال یہاں رہے ہو۔

لیکن اپنے کھانے پینے کی چیزوں کی طرف دیکھو، کیسے طویل مدت میں حکم خدا کی وجہ سے ان میں تغیر نہیں آیا۔ یعنی وہ خدا جو تمہاری جلد خراب ہونے والی غذا کو صحیح وسالم رکھ سکتا ہے اس کے لئے مردوں کو زندہ کرنا آسان ہے کیونکہ یہاں یک سرح سے زندگی کا ادامہ ہے، اور غذا کو صحیح وسالم رکھنا جس کی عمر کم ہوتی ہے مردوں کو زندہ کرنے سے آسان ہے۔ یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس پیغمبر کے ساتھ کونسی غذا تھی۔ قرآن نے نہیں بیان کیا، بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ ان کی غذا ''انجیر'' اور پھلوں کا رس تھا، جبکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں بہت جلد خراب ہو جاتی ہیں، لہٰذا ان دونوں کا باقی رہنا ایک اہم موضوع ہے۔

اس کے بعد دوبارہ حکم ہوا کہ اب اس دلیل کے لئے کہ تم جان لو کہ تمہیں سو سال موت کے عالم میں گزر گئے ذرا اپنی سواری کی طرف نگاہ کرو اور دیکھو کہ کھانے پینے کی چیزوں کے برعکس وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر چکی ہے اور طبیعت کے عام قوانین اسے اپنی لپیٹ میں لے چکے ہیں، اور موت نے اس کے جسم کو منتشر کر دیا ہے۔

اب دیکھو کہ ہم اس کے پراگندہ اجزاء کو کیسے جمع کر کے اسے زندہ کرتے ہیں، اس نے یہ منظر دیکھا تو کہنے لگا: میں جانتا ہوں کہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے یعنی میں مطمئن ہو چکا ہوں اور مردوں کے دوبارہ اٹھنے کا معاملہ متشکل ہو کے میرے سامنے آ گیا ہے۔ اس بارے میں کہ وہ پیغمبر کون تھے، مختلف احتمالات دیئے گئے ہیں، بعض نے ''ارمیا'' کہا ہے اور بعض ''خضر'' سمجھتے ہیں لیکن مشہور یہ ہے کہ وہ ''عزیر'' تھے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں بھی حضرت عزیر علیہ السلام کے نام کی تائید ہوتی ہے۔ یہ بھی سوال اٹھتا ہے کہ یہ آبادی کہاں تھی، بعض اسے بیت المقدس سمجھتے ہیں جو ''بخت النصر'' کے حملوں کی وجہ سے ویران اور برباد ہو چکا تھا، لیکن یہ احتمال بعید نظر آیا ہے''۔ [1]

حضرت عزیر علیہ السلام نے دین یہود کی بہت خدمت کی

عربی زبان میں ''عزیز'' انہی کو کہا جاتا ہے جو یہودیوں کی لغت میں ''عزرا'' کہلاتے ہیں، عرب چونکہ جب غیر زبان کا کوئی نام اپناتے ہیں تو عام طور پر اس میں تبدیلی کر دیتے ہیں خصوصاً اظہار محبت کے لئے اسے صیغہ تصغیر میں بدل لیتے ہیں۔ ''عزرا'' کو بھی ''عزیز'' میں تبدیل کیا گیا ہے جیسا کہ ''عیسیٰ'' کے اصل نام کو جو در اصل ''یسوع'' تھا اور ''یح'' کو جو کہ ''یوحنا'' تھا بدل دیا۔

بہر حال عزیر یا عزرا یہودیوں کی تاریخ میں ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں یہاں تک کہ ان میں سے بعض ملت وقوم کی بنیاد اور اس جمعیت کی تاریخ کی درخشندگی کی نسبت ان کی طرف دیتے ہیں۔ درحقیقت حضرت عزیر علیہ السلام نے اس دین کی بڑی خدمت کی ہے

---

[1] یہ واقعہ سورہ بقرہ کی آیت 259 کی ذیل میں بیان ہوا ہے۔

کیونکہ ''بخت النصر'' بادشاہ ''بابل'' نے یہود کو نیست و نابود کر دیا تھا اور ان کے شہر اس کی فوج کے ہاتھ آگئے، ان کا عبادت خانہ ویران ہو گیا اور ان کی کتاب توریت جلا دی گئی، ان کے مرد قتل کر دیئے گئے اور ان کی عورتیں اور بچے قید کر کے بابل کی طرف منتقل کر دیئے گئے اور وہ تقریباً ایک سو سال وہیں رہے۔

پھر جب ایران کے بادشاہ ''کورش'' نے بابل فتح کیا تو عزرا جو اس وقت کے یہودیوں کے ایک سردار اور بزرگ تھے اس کے پاس آئے اور اسے ان کے بارے میں سفارش کی، ''کورش'' نے ان سے موافقت کی کہ یہودی اپنے شہروں کی طرف پلٹ جائیں اور نئے سرے سے توریت لکھی جائے، اسی لئے یہودی انہیں ایک نجات دہندہ اور اپنے دین کا زندہ کرنے والا سمجھتے ہیں، اسی بناء پر ان کا حد سے زیادہ احترام کرتے ہیں۔

اسی امر کے سبب یہودیوں کے ایک گروہ نے انہیں ''ابن اللہ'' (اللہ کا بیٹا) کا لقب دیا، اگرچہ بعض روایات سے مثلاً احتجاج طبرسی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ لقب حضرت عزیر علیہ السلام کے احترام کے طور پر استعمال کرتے تھے لیکن اسی روایت میں ہے کہ جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ اگر تم حضرت عزیر علیہ السلام کا ان عظیم خدمات کی وجہ سے احترام کرتے ہو اور اس بناء پر انہیں اس نام سے پکارتے ہو تو پھر یہ لقب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کیوں نہیں دیتے جب کہ انھوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کی نسبت تمہاری بہت زیادہ خدمت کی ہے تو وہ اس کا کوئی جواب نہ دے سکے اور نہ ہی اس کا کوئی جواب تھا۔

بہر حال اس نام سے بعض لوگوں کے اذہان میں احترام سے بالاتر صورت ہو گئی اور جیسا کہ عوام کی روش ہے کہ اس سے اپنی فطرت کے مطابق حقیقی مفہوم لیتے تھے اور انھیں واقعاً خدا کا بیٹا خیال کرتے تھے کیونکہ ایک تو حضرت عزیر علیہ السلام نے انہیں دربدری زندگی سے نجات دی تھی اور دوسرا توریت لکھ کر ان کے دین کو ایک نئی زندگی بخشی تھی، البتہ ان کا یہ عقیدہ نہ تھا لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک گروہ خصوصیت سے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تھا کہ یہی نظر فکر تھی یہی وجہ ہے کہ کسی تاریخ میں یہ نہیں ہے کہ انھوں نے آیت کو سن کر کہ ''یہود کہتے ہیں: عزیر اللہ کا بیٹا ہے''[1] ان کا کیا ہوا یا انھوں نے کوئی آواز بلند کی ہو، اگر ایسا ہوتا تو یقیناً وہ کوئی ردّعمل ظاہر کرتے۔

حضرت زکریا و یحییٰ علیہما السلام

حضرت زکریا علیہ السلام کی بیوی اور جناب مریم سلام اللہ علیہا کی والدہ آپس میں بہنیں تھیں۔

اتفاق کی بات ہے کہ دونوں ابتداء میں بانجھ تھیں، جناب مریم سلام اللہ علیہا کی والدہ کو ایسی لائق بیٹی نصیب ہوئی، حضرت زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے خلوص اور حیران کن خصوصیات کو دیکھا تو آرزو کی ان کی بھی مریم سلام اللہ علیہا جیسی پاکیزہ اور پرہیز گار اولاد ہو جس کا چہرہ عظمت الٰہی اور توحید کی علامت ہو۔

حضرت زکریا علیہ السلام اور ان کی بیوی کی طویل زندگی اسی طرح گزر چکی تھی ظاہری طبیعی قوانین اور فطرت کے نقطۂ نظر سے یہ بعید نظر آتا تھا کہ اب ان کی کوئی اولاد ہو۔

لیکن عشق الٰہی اور مریم سلام اللہ علیہا کے محراب عبادت کے پاس بے موسم کے پھل دیکھنے کا اثر تھا کہ حضرت زکریا علیہ السلام کے دل میں بھی امید پیدا ہوئی اور انھوں نے بڑھاپے کے موسم میں خواہش کی کہ کیا ان کے وجود کی شاخ پر بھی فرزند کی صورت میں میوہ پیدا ہو

---

[1] سورہ توبہ آیت 30

جائے لہٰذا جب وہ عبادت اور مناجات میں مشغول تھے انھوں نے خداوند عالم سے فرزند کا تقاضا کیا: ''خداوندا مجھے پاکیزہ فرزند عطا فرما کہ تو بندوں کی دعائیں سننے والا ہے''۔[1]

ولادت یحییٰ علیہ السلام کی بشارت

زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ زکریا علیہ السلام کی دعا قبول ہوگئی۔

''وہ محراب عبادت میں مناجات کر رہے تھے کہ خدا کے فرشتوں نے انہیں آواز دی اور بشارت دی کہ خداوند عالم انہیں بہت جلد ایک بیٹا دے گا جس کا نام یحییٰ ہوگا''۔[2]

''جو ان صفات کا حامل ہوگا؛

1. وہ حضرت مسیح پر ایمان لائے گا اور اپنے ایمان سے انہیں تقویت پہنچائے گا''۔[3]

یاد رہے کہ قرآن مجید میں مختلف آیات میں ''کلمہ'' سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور جیسا کہ تاریخ میں آیا ہے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے چھ ماہ بڑے ہیں اور وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے جناب مسیح علیہ السلام کی نبوت کی تصدیق کی۔

اور چونکہ وہ لوگوں میں پاکیزگی اور زہد و تقویٰ کے اعتبار سے بہت زیادہ شہرت رکھتے تھے لہٰذا جب حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف ان کی رغبت، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت و نبوت کی طرف لوگوں کی توجہ کے لئے بہت مؤثر ثابت ہوئی

2. علم و عمل سے لحاظ کے معاشرے کی رہبری ان کے ذمہ ہوگی۔
3. علاوہ ازایں وہ اپنے تئیں سرکش ہوا و ہوس اور دنیا پرستی سے محفوظ رکھیں گے۔[4]
4. ''وہ خدا کے پیغمبر اور صالحین میں سے ہوں گے''۔[5]

ملائکہ نے یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کی بشارت دی تو حضرت زکریا علیہ السلام تعجب میں پڑ گئے اور بارگاہ خداوندی میں عرض کرنے لگے: خداوندا: کیسے ممکن ہے کہ مجھ سے بچہ ہو جب کہ میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔

جواب میں وحی آئی:

''خدا اسی طرح جو کچھ چاہے انجام دے لیتا ہے۔''[6]

یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کی نشانی

یہاں حضرت زکریا علیہ السلام، یحیٰ علیہ السلام کی ولادت پر کسی نشانی کی درخواست کرتے ہیں، جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس عجیب و

---

[1] سورہ آل عمران آیت 38
[2] سورہ آل عمران آیت 39
[3] سورہ آل عمران آیت 39
[4] سورہ آل عمران آیت 39
[5] سورہ آل عمران آیت 39
[6] سورہ آل عمران آیت 40

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کا تعجب اور حیرانی کس بناء پر تھی جب کہ خداوند عالم کی بے پایاں قدرت پر بھی ان کی نظر تھی۔

غرب واقعے پر حضرت زکریا علیہ السلام کا اظہار تعجب اور پروردگار سے کسی نشانی کا تقاضا کسی طرح سے بھی اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر بے اعتمادی کی دلیل نہیں ہے، خصوصاً جب کہ قرآن کی دیگر آیات پر نظر کرنے سے سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ حضرت زکریا علیہ السلام معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ایک بانجھ عورت جو کئی سال سے ماہانہ عادت بھی چھوڑ چکی تھی اس کے یہاں بچہ پیدا ہونا کیونکر ممکن ہے، اس میں کیا تغیر و تبدل ہوگا کیا پھر سے جوان یا ادھیڑ عمر کی عورتوں کی طرح سے ماہواری آنے لگے گی یا وہ کسی اور طرح سے بچے کی پیدائش کے قابل ہو جائیں گی۔

علاوہ ازیں قدرت خداوندی پر ایمان شہود اور مشاہدے سے الگ چیز ہے، حضرت زکریا علیہ السلام دراصل چاہتے تھے کہ ایمان درجہ شہود تک پہنچ جائے، یہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پرندوں کے واقعے سے ملتی جلتی ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاد اور قیامت پر ایمان تو تھا لیکن وہ اس طرح اطمینان حاصل کرنا چاہتے تھے، یہ فطری امر ہے کہ انسان جب طبیعی قوانین کے خلاف کسی امر کا سامنا کرتا ہے تو وہ غور و فکر میں پڑ جاتا ہے اور اسے خواہش ہوتی ہے کہ اس کے لئے کوئی حسی دلیل حاصل کرے۔ ''اسی طرح خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے'' کہہ کر بشارت الٰہی کی تاکید بھی کی جا چکی ہے، حضرت زکریا علیہ السلام چاہتے تھے کہ اس امر سے ان کا ایمان، ایمان شہودی کا درجہ حاصل کر لے، وہ چاہتے تھے کہ ان کا دل اطمینان سے مالا مال ہو جائے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مشاہدہ حسی کے ذریعے اطمینان کے حصول کی خواہش کی تھی، وہ بھی اس مرحلے تک جا پہنچیں۔

خداوند عالم نے حضرت زکریا علیہ السلام کی یہ درخواست بھی قبول فرمالی اور اس کے لئے ایک نشانی مقرر فرمائی گئی کہ ان کی زبان کسی طبیعی عامل کے بغیر تین دن کے لئے بے کار ہو گئی، وہ عام گفتگو نہ کر سکتے تھے لیکن خداوند عالم کے ذکر اور اس کی تسبیح کے وقت ان کی زبان بغیر کسی تکلیف کے کام کرتی تھی، یہ عجیب و غریب کیفیت تمام امور پر اللہ کی قدرت کے لئے ایک نشانی تھی، وہ خدا جو بند زبان کو اپنے ذکر کے وقت کھول دینے کی طاقت رکھتا ہے وہ یہ قدرت بھی رکھتا ہے کہ کسی بانجھ رحم سے ایسا باایمان بچہ پیدا کر دے جو ذکر پروردگار کا مظہر ہو اسی سے اس نشانی کا اس چیز سے ربط ظاہر ہو جاتا ہے جو حضرت زکریا علیہ السلام چاہتے تھے۔

ممکن ہے اس نشانی میں ایک نکتہ بھی پنہاں ہو اور وہ یہ کہ اس مسئلے میں جناب زکریا علیہ السلام اصرار اور نشانی کا تقاضا اگرچہ فعل حرام اور مکروہ نہ تھا لیکن بہر حال ترک اولیٰ سے کچھ مشابہ ضرور تھا اسی لئے خداوند عالم کی طرف سے ایسی نشانی دی گئی جو قدرت نمائی تھی اور ترک اولیٰ پر تنبیہ اور اشارہ بھی تھا۔

یہ بات جالب نظر ہے کہ اس دعا کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کو ایک ایسا بیٹا عطا فرمایا جو کئی لحاظ سے حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے بیٹے سے مشابہت رکھتا ہے۔

مثلاً: بچپن میں بعثت نبوت کے لحاظ سے۔

نام کے مفہوم کے اعتبار سے۔

کیونکہ عیسیٰ اور یحییٰ علیہما السلام دونوں کا معنی ہے ''زندہ رہتا ہے'' اور اللہ تعالیٰ نے دونوں پر، موت اور حشر و نشر تین مواقع پر درود و سلام بھیجا ہے۔

یحییٰ علیہ السلام، عشق الٰہی میں سرشار پیغمبر

حضرت یحییٰ علیہ السلام خداوند متعال کے ایک عظیم پیغمبر تھے اور ان کی خصوصیات میں سے ایک یہ تھی کہ وہ بچپن میں مقام نبوت

پر فائز ہوئے، خداوند متعال نے انہیں اس سن وسال میں ایسی روشن عقل اور اتنی تابناک فہم وفراست عطا فرمائی کہ وہ اس عظیم منصب کو قبول کرنے کے لائق قرار پائے۔

بہرحال منابع اسلامی اور منابع مسیحی سے معلوم ہوتا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خالہ کے بیٹے تھے۔

منابع مسیحی میں تصریح ہوئی ہے، کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو غسل تعمید دیا اور اسی لئے انہیں ''یحییٰ تعمید دہندہ'' کے نام سے پکارتے ہیں، (غسل تعمید ایک مخصوص غسل ہے کہ جو عیسائی اپنے بیٹوں کو دیتے ہیں۔ اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ اسے گناہ سے پاک کرتا ہے) اور جب حضرت مسیح علیہ السلام نے اعلان نبوت کیا تو حضرت یحییٰ علیہ السلام ان پر ایمان لائے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں بعض چیزیں قدر مشترک تھیں، انتہائی زیادہ زہد وتقوی، کچھ اسباب کی بناء پر ترک ازدواج، معجزانہ طور پر پیدا ہونا اور اسی طرح بہت ہی زیادہ قریبی نسب۔ [1]

''یحییٰ'' ''حیوۃ'' کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ہے ''زندہ رہتا ہے'' اور یہ اس عظیم پیغمبر کا نام رکھا گیا تھا، زندگی سے یہاں مراد مادی اور معنوی دونوں طرح کی زندگی ہے جو ایمان، منصب نبوت اور خدا سے ربط کے زیر سایہ ہو، سورہ مریم کی آیت 7 سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش سے قبل ہی یہ نام ان کے لئے انتخاب فرمایا تھا۔

''اے زکریا ہم تجھے ایک فرزند کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہے اور قبل ازایں کسی کا یہ نام نہیں تھا۔''

یحییٰ علیہ السلام کی عمدہ صفات

قرآن مجید میں ان دس نعمات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو خدا نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو عطا فرمائی تھیں یا انھوں نے توفیق الٰہی سے کسب کی تھیں۔

1۔ ''ہم نے اسے بچپن میں فرمان نبوت اور عقل وہوش ودرایت عطا کی''۔

2۔ ''ہم نے اپنی طرف سے اپنے بندوں کے لئے رحمت ومحبت بخشی''۔

3۔ ''ہم نے اسے روح وجان اور عمل کی پاکیزگی عطا کی''۔

4۔ ''وہ پرہیزگار تھے'' اور جو بات فرمان پروردگار کے مخالف ہوتی تھی اس سے دوری اختیار کرتے تھے۔

5۔ ''اسے ہم نے اپنے ماں باپ کے ساتھ خوش گفتار، نیکوکار اور محبت کرنے والا پایا''۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت بھی کئی ایک جہات سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی شہادت کی مانند تھی (حضرت یحییٰ علیہ السلام کے قتل کی کیفیت ہم بعد میں تفصیل سے بیان کریں گے)۔

امام حسین علیہ السلام کا نام بھی حضرت یحییٰ علیہ السلام کے نام کی طرح بے سابقہ تھا (پہلے کسی کا یہ نام نہیں تھا) اور ان کی مدت حمل (جس وقت شکم مادر میں تھے) معمول کی نسبت بہت کم تھی۔

6۔ ''وہ خلق خدا سے خود کو برتر سمجھنے والا اور ظالم ومستکبر نہیں تھا''۔

---

[1] اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام میں بھی بعض باتیں مشترک تھیں، لہٰذا امام علی بن الحسین زین العابدین علیہ السلام نے اس طرح نقل ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ہم امام حسین علیہ السلام کے ساتھ (کربلا کی طرف جاتے ہوئے) باہر نکلے تو امام جس منزل میں نزول اجلال فرماتے یا اس سے کوچ کرتے تو یحییٰ علیہ السلام اور ان کے شہید ہونے کو یاد کرتے اور فرماتے کہ خداوند تعالی کے نزدیک دنیا کی بے قدری کے لئے یہی کافی ہے کہ یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کا سر بنی اسرائیل کے بدکاروں میں سے ایک بدکار کے پاس ہدیہ کے طور پر لایا گیا۔

7۔ ''وہ معصیت کار اور گناہ سے آلودہ نہیں تھا''۔

8، 9، 10۔ ''اور چونکہ وہ ان عظیم افتخارات اور عمدہ صفات کا مالک تھا، لہٰذا جس دن وہ پیدا ہوا اس دن بھی اور جس دن اس کو موت آئے اس دن بھی اور جس دن وہ دوبارہ زندہ کر کے قبر سے اٹھایا جائے گا اس دن بھی، اس پر ہمارا درود وسلام ہو''۔ [1]

بچپن میں نبوت

یہ درست ہے کہ انسان کی عقل کے ارتقاء کا دور عام طور پر ایک خاص حد پر ہوتا ہے، لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ انسانوں میں ہمیشہ ہی بعض مستثنیٰ افراد موجود رہے ہیں، تو اس بات میں کونسا امر مانع ہے کہ خداوند متعال (عقل کے ارتقاء کے) اس دور کو بعض بندوں کے لئے کچھ مصالح کی بناء پر زیادہ مختصر کر دے اور کم اسے کم عرصہ میں اسے مکمل کر دے جیسا کہ بچوں کے لئے بولنا سیکھنے کے لئے عام طور پر دو سال کا گزرنا ضروری ہوتا ہے جب کہ ہم جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بالکل ابتدائی دنوں میں بات کی، اور وہ ایسی بات تھی جو بہت ہی پر معنیٰ تھی اور معمول کے مطابق بڑی عمر کے افراد کے شایان شان تھی۔ [2]

ایک روایت میں امام جواد حضرت محمد بن علی النقی علیہ السلام کے ایک صحابی سے کہ جس کا نام علی بن اسباط تھا منقول ہے کہ: ''میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا (جب کہ آپ کا سن بہت چھوٹا تھا) میں ان کے قد وقامت میں گم ہو گیا تا کہ اسے اپنے ذہن میں بٹھا لوں اور جب میں واپس مصر لوٹ کر جاوں تو اپنے دوستوں سے اس بات کے کم وکیف کو بیان کروں، عین اسی وقت جب کہ میں سوچ ہی رہا تھا کہ حضرت بیٹھ گئے (گویا آپ نے میری تمام سوچ کا مطالعہ کر لیا تھا) میری طرف رخ کیا اور فرمایا: اے علی بن اسباط خداوند متعال نے مسئلہ امامت میں جو کام کیا ہے وہ اسی کام کی طرح ہے کہ جو نبوت میں کیا ہے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی شہادت

نہ صرف حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش تعجب خیز تھی بلکہ ان کی موت بھی کئی لحاظ سے عجیب تھی، اکثر مسلمان مؤرخین اور اسی طرح مشہور مسیحی منابع ان کی شہادت کے واقعہ کو اس طرح نقل کرتے ہیں (اگر چہ اس کی خصوصیات میں کچھ تھوڑا بہت تفاوت دکھائی دیتا ہے): حضرت یحییٰ علیہ السلام اپنے زمانے کے ایک طاغوت کے اپنی ایک محرم سے غیر شرعی روابط کے خلاف آواز کی بناء پر شہید ہوئے، ہوا یہ کہ ''ہیرودیس''، فلسطین کا ہوس پرست بادشاہ تھا، وہ اپنے بھائی کی بیٹی ''ہیرودیا'' پر عاشق ہو گیا، وہ بہت خوبصورت تھی، اس کے حسن نے اس کے دل میں عشق کی آگ بھڑکا دی۔ بادشاہ نے اس سے شادی کرنے کا پکا ارادہ کر لیا۔

یہ خبر جب خداوند متعال کے بزرگ پیغمبر حضرت یحییٰ علیہ السلام کو پہنچی تو انھوں نے صراحت کے ساتھ اعلان فرمایا کہ یہ شادی ناجائز ہے اور توریت کے احکام کے خلاف ہے اور میں ایسے کام کی اپنی پوری طاقت کے ساتھ مخالفت کروں گا۔ اس مسئلہ کی تمام شہر میں شہرت ہو گئی، اور یہ خبر اس لڑکی ''ہیرودیا'' کے کانوں تک بھی جا پہنچی، وہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو اپنے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھنے لگی، اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ کسی مناسب موقع پر ان سے انتقام لے گی اور اپنی ہوا وہوس کی راہ سے اس روکاوٹ کو ہٹا دے گی، اس نے اپنے چچا کے ساتھ اپنے راہ رسم میں اضافہ کر دیا اور اپنے حسن وجمال کو اس کے لئے ایک جال بنا دیا اور اس پر اس طرح سے

---

[1] مذکورہ صفات سورہ مریم کی آیت 12 تا 15 میں بیان ہوئی ہیں۔

[2] یہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے، کہ وہ اشکال جو کچھ افراد نے شیعوں کے بعض ائمہ کے بارے میں کیا ہے، کہ ان میں سے بعض کم عمری میں مقام امامت پر کیسے پہنچ گئے، درست نہیں ہے۔

اثر انداز ہوئی کہ ایک دن ہیرودیس نے اس سے کہا کہ تیری جو بھی آرزو ہے مجھ سے مانگ تو جو کچھ چاہے گی وہ تجھے ملے گا۔''ہم نے یحییٰ کو بچپن میں فرمان نبوت وعقل و دانش عطا کی۔ اور کبھی انسانوں کے بارے میں فرماتا ہے: ''جبکہ انسان، کامل عقل کی حد بلوغ، چالیس سال کو پہنچ گیا۔لہٰذا جس طرح خدا کے لئے یہ ممکن ہے بچپن میں حکمت عطا کرے اس کی قدرت اس کو چالیس سال میں حکمت عطا کرتی ہے''۔ ہیرودیا نے کہا میں یحییٰ کے سر کے سوا اور کچھ نہیں چاہتی، کیونکہ اس نے مجھے اور تجھے بدنام کر کے رکھ دیا ہے، تمام لوگ ہماری عیب جوئی کر رہے ہیں، اگر تو یہ چاہتا ہے کہ میرے دل کو سکون حاصل ہو اور میرا دل خوش ہو تو تجھے یہ کام انجام دینا چاہئے۔ ہیرودیس جو اس عورت کا دیوانہ تھا انجام پر غور کئے بغیر یہ کام کرنے پر تیار ہو گیا، اور ابھی دیر نہ گزری تھی کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر اس بدکار عورت کو پیش کر دیا، لیکن اخر کار اس کے لئے اس کام کے ہولناک نتائج نکلے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم سلام اللہ علیہا

''حنہ'' اور ''اشیاع'' دو بہنیں تھیں۔ پہلی حضرت عمران کے نکاح میں آئیں۔ حضرت عمران بنی اسرائیل کی بہت اہم شخصیت تھے۔ دوسری کو اللہ کے ایک نبی زکریا علیہ السلام نے اپنی زوجیت کے لئے منتخب فرمایا۔

کئی سال گزر گئے۔ حنہ کے یہاں کوئی بچہ پیدا نہ ہوا۔ ایک روز وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھی تھیں۔ دیکھا کہ ایک پرندہ اپنے بچوں کو غذا دے رہا ہے۔ یہ منظر دیکھا تو اولاد کی خواہش ان کے دل میں آگ کی طرح بھڑک اٹھی۔ انہوں نے خلوص دل سے بارگاہ خداوندی میں بیٹے کی درخواست کی، تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا یہ مخلصانہ دعا ہدف اجابت کو پہنچی اور وہ حاملہ ہو گئیں۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حنہ کے شوہر حضرت عمران کی طرف وحی کی تھی کہ انہیں ایک بابرکت لڑکا عطا کیا جائے گا، جو لاعلاج مریضوں کو شفا دے گا۔ حکم خدا سے مردوں کو زندہ کرے گا اور بنی اسرائیل کے لئے پیغمبری کے فرائض بھی انجام دے گا۔ انہوں نے یہ واقعہ اپنی بیوی سے بیان کیا۔ وہ حاملہ ہوئیں تو ان کا خیال تھا کہ یہی وہ لڑکا ہے جو اس وقت ان کے رحم میں ہے۔ وہ بے خبر تھیں کہ ان کے رحم میں تو اس لڑکے کی والدہ جناب مریم سلام اللہ علیہا ہیں۔ اسی لئے انہوں نے نذر کی تھی کہ بیٹے کو خانہ خدا بیت المقدس کا خدمت گزار بنائیں گی۔

قرآن میں زوجہ عمران کی نذر کا تذکرہ ہے۔ وہ حاملہ ہوئیں تو انہوں نے نذر کی کہ اپنے بچے کو بیت المقدس کا خدمت گزار بنائیں گی کیونکہ اللہ نے ان کے شوہر عمران کو جو اطلاع دی تھی اس سے وہ یہ سمجھے بیٹھی تھیں کہ ان کے یہاں لڑکا ہوگا۔''محرراً'' استعمال کیا ہے اور ''محررۃ'' نہیں کہا، انھوں نے خدا سے درخواست کی وہ ان کی نذر قبول کرے، ''محرر'' ''تحریر'' کے مادے سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے ''آزاد کرنا'' اس زمانے میں یہ لفظ ایسی اولاد کے لئے بولا جاتا تھا جو عبادت خانے کی خدمت کے لئے معین کئے جائے تا کہ وہ عبادت خانے کی صفائی اور دوسری خدمات انجام دیں اور فراغت کے وقت پروردگار کی عبادت میں مشغول رہیں۔''محرر'' ان خدمت گزاروں کو اس لئے کہتے تھے کہ وہ ماں باپ کی ہر قسم کی خدمت سے آزاد ہوتے تھے اور عبادت خانے کی خدمت کو اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے تھے۔

بعض کہتے ہیں جب بچے خدمت کے کچھ قابل ہو جاتے، بالغ ہونے تک ماں باپ کی نگرانی میں خدمت انجام دیتے تھے اور بعد ازاں خود سے کام کرنے لگتے تھے چاہتے تو عبادت خانے میں اپنا کام ختم کر کے باہر چلے جاتے اور چاہتے تو کام جاری رکھتے۔

پالنے والے یہ تو لڑکی ہے

جب پیدائش ہوئی تو مادر مریم سلام اللہ علیہا نے دیکھا کہ وہ لڑکی تھی۔اب وہ پریشان ہوئیں۔سوچنے لگیں کہ کیا کروں کیونکہ بیت المقدس کی خدمت تو لڑکے کیا کرتے ہیں۔قبل ازیں کبھی کسی لڑکی کو بیت المقدس کی خدمت گزاری کے لئے منتخب نہیں کیا گیا تھا۔ قرآن میں بچی کی ولادت کے بعد مادر مریم سلام اللہ علیہا کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔انہوں نے پریشان ہوکر کہا: خداوند میں نے بچی کو جنم دیا ہے اور تو جانتا ہے کہ جو نذر میں نے کی ہے اس کے لئے لڑکی لڑکے کی طرح نہیں ہوسکتی اور لڑکی لڑکے کی طرح ان فرائض کو انجام نہیں دے سکتی۔[1]

لیکن قرآن کہتا ہے کہ ''خدا تعالیٰ نے مریم سلام اللہ علیہا کو حسن قبول سے نوازا اور ان کی پرورش اچھے پودے کی طرح کی''۔[2]

درحقیقت جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے کہ جناب مریم سلام اللہ علیہا کی والدہ کو یقین نہیں آتا تھا کہ کسی لڑکی کو خانہ خدا بیت المقدس کی خدمت کے لئے قبول کرلیا جائے گا لہٰذا وہ چاہتی تھیں کہ ان کے شکم میں جو بچہ ہے وہ لڑکا ہو کیونکہ قبل ازیں کبھی کسی لڑکی کو اس مقصد کے لئے منتخب نہیں کیا گیا تھا۔

لیکن کہ خدا تعالیٰ نے اس پاکیزہ لڑکی کو پہلی مرتبہ اس روحانی اور معنوی خدمت کے لئے قبول کرلیا۔

بعض مفسرین کہتے ہیں: قبولیت کی نشانی یہ تھی کہ حضرت مریم سلام اللہ علیہا بیت المقدس کی خدمت کے دوران میں ماہواری میں کبھی مبتلا نہیں ہوئیں کہ انہیں اس روحانی مرکز سے دور ہونا پڑتا۔ممکن ہے اس نذر کی قبولیت اور جناب مریم سلام اللہ علیہا کا قبول بارگاہ ہونا، اس کے بارے میں ان کی والدہ کو الہام کے ذریعے مطلع کیا گیا ہو۔

قرآن کہتا ہے: ''خدا نے زکریا کو مریم سلام اللہ علیہا کی کفالت کے لئے منتخب کیا تھا کیونکہ جیسا کہ تاریخ میں آیا ہے، مریم سلام اللہ علیہا کے والدان کی پیدائش سے پہلے وفات پا چکے تھے''۔

حضرت مریم سلام اللہ علیہا کا یہ نام ان کی والدہ کے ذریعے سے وضع حمل کے وقت ہی رکھ دیا گیا تھا۔ یاد رہے کہ ''مریم سلام اللہ علیہا'' ان کی لغت میں ''عبادت گزار خاتون'' کو کہتے تھے۔

یہ نام حضرت مریم سلام اللہ علیہا کی پاکباز والدہ کے اس انتہائی عشق اور لگاؤ کا مظہر ہے جو انہیں اپنے بچے کو عبادت الٰہی کے لئے وقف کرنے کے لئے تھا لہٰذا انہوں نے نام رکھنے کے ساتھ ہی خدا سے درخواست کی کہ وہ اس نومولود بچی اور اس کی آئندہ اولاد کو شیطانی وسوسوں سے بچائے رکھے اور انہیں اپنے لطف وکرم کی پناہ میں رکھے۔

مریم سلام اللہ علیہا کی پرورش کے لئے قرعہ کشی

جناب مریم سلام اللہ علیہا کی والدہ پیدائش کے بعد اپنی نوزائیدہ بچی کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر عبادت خانے میں لے آئیں۔وہاں بنی اسرائیل کے علماء اور بزرگوں سے کہنے لگیں: یہ نومولود بچی خانہ خدا کی خدمت کے لئے نذر کی گئی ہے اس کی سرپرستی اپنے ذمے لے لیں۔

جناب مریم سلام اللہ علیہا چونکہ حضرت عمران علیہ السلام کے خاندان سے تھیں اور یہ ایک بزرگ خاندان تھا اس لئے بنی اسرائیل کے

---

[1] سورہ آل عمران 26

[2] سورہ آل عمران آیت 37

علماء اور عبادان کی سرپرستی کا منصب حاصل کرنے کے لے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔

قرعہ ڈال کر فیصلہ کرنے پر ان کا اتفاق ہو گیا۔ وہ ایک نہر کے کنارے گئے وہاں انہوں نے اپنی قرعہ ڈالنے کی لکڑیاں پیش کیں۔ ان میں سے ہر ایک لکڑی یا قلم پر ان میں سے ایک ایک کا نام لکھا گیا۔ جو قلم پانی میں ڈوب جاتی اس کا قرعہ نکلتا صرف جس کی قلم سطح آب پر رہتی اس کے نام قرعہ شمار ہوتا۔ جس قلم پر حضرت زکریا علیہ السلام کا نام تھا پہلے پانی کی گہرائی میں چلی گئی اور پھر پانی پر ابھر آئی۔

یوں حضرت مریم سلام اللہ علیہا کی سرپرستی کا منصب حضرت زکریا علیہ السلام کے حصے آیا اور حقیقت میں بھی وہی اس کام کے لئے اہل تر تھے کیونکہ ایک تو وہ پیغمبر خدا تھے اور دوسرے ان کی بیوی حضرت مریم سلام اللہ علیہا کی خالہ تھیں۔

پھر اس واقعے کے ایک حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: مریم سلام اللہ علیہا کی سرپرستی کے تعین کے لئے جب وہ اپنی قلمیں پانی میں ڈال رہے تھے تم موجود نہ تھے۔

''یونہی جب وہ کفالت مریم سلام اللہ علیہا پر جھگڑ رہے تھے تم پاس نہ تھے اور یہ سب کچھ تم پر صرف وحی کے ذریعے نازل ہوا ہے''۔ [1]

جناب مریم کے سرپرست حضرت زکریا علیہ السلام

جناب مریم سلام اللہ علیہا حضرت زکریا علیہ السلام کی سرپرستی میں پروان چڑھیں اور خدا کی عبادت و بندگی میں اس طرح مستغرق ہوئیں کہ ابن عباس کے بقول جب وہ نو سال کی ہوئیں تو دن کو روزہ رکھتیں اور رات کو عبادت کرتیں۔ پرہیز گاری اور معرفت الٰہی میں انہوں نے اتنی ترقی کی کہ اس دور کے احبار اور پارسا علماء سے بھی سبقت لے گئیں۔

حضرت زکریا علیہ السلام ان کے محراب کے پاس آکر دیکھتے تو خاص غذائیں رکھی رہتی تھیں۔ انہیں بہت حیرانی ہوتی۔ ایک دن پوچھنے لگے: ''یہ کھانے کہاں سے لائی ہو؟''۔

مریم سلام اللہ علیہا بولیں: ''یہ خدا کی طرف سے ہے اور وہ تو جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے''۔ [2]

یہ غذا کیسی تھی؟ اور جناب مریم سلام اللہ علیہا کے لئے کہاں سے آتی تھی؟ اس بارے میں قرآن میں کچھ بیان نہیں کیا گیا لیکن بہت سی شیعہ وسنی کتب کی روایات سے جو تفسیر عیاشی وغیرہ میں مذکورہ ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے پھلوں کی ایک قسم تھی جو بے موسم حکم پروردگار سے جناب مریم سلام اللہ علیہا کے محراب کے پاس پہنچ جاتے اور یہ بات کوئی باعث تعجب نہیں ہے کہ خدا متعال اپنے کسی پرہیز گار بندے کی یوں پذیرائی کرے۔

ایک روایت امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے: ایک روز پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے گھر تشریف لائے۔ حالت یہ تھی کہ کئی روز سے ان کے یہاں ٹھیک سے کھانا بھی میسر نہ تھا اچانک آپؐ نے ان کے پاس مخصوص غذا دیکھی۔ آپؐ نے پوچھا: ''یہ کھانا کہاں سے آیا ہے؟''

حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا نے عرض کیا:

---

[1] سورہ آل عمران آیت 44

[2] سورہ آل عمران آیت 37

''خدا کے یہاں سے، کیونکہ وہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے''۔

اس پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یہ واقعہ حضرت زکریا علیہ السلام کے واقعے کی طرح ہے، وہ جناب مریم سلام اللہ علیہا کے محراب کے پاس آئے تھے، وہاں کھانے کی کوئی خاص چیز دیکھی تو پوچھنے لگے: یہ کھانا کہاں سے آیا ہے تو انہوں نے جواب میں کہا کہ خدا کے یہاں سے آیا ہے''۔

فرشتے جناب مریم سلام اللہ علیہا سے باتیں کرتے ہیں

جناب مریم سلام اللہ علیہا کی ایک بلند فضیلت یہ تھی کہ فرشتے ان سے باتیں کیا کرتے تھے جس سے آپؑ کی عظمت واضح ہو جاتی ہے۔

''فرشتے حضرت مریم سلام اللہ علیہا کو بشارت دیتے ہیں کہ خدا نے انہیں برگزیدہ کیا اور چن لیا ہے اور انہیں پاک قرار دیا''۔ [1]

یعنی تقوی، پرہیزگاری، ایمان اور عبادت کے نتیجے میں وہ خدا کے برگزیدہ اور پاک لوگوں میں سے ہوگئی ہیں اور انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے پیغمبر کی پیدائش کے لئے چن لیا گیا ہے۔

پہلا حصہ جناب مریم سلام اللہ علیہا کی اعلی انسانی صفات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور برگزیدہ انسان کے طور پر آپ کا نام لیتا ہے اور دوسرے حصے میں ''اصطفك''، ان کے اپنے زمانے کی تمام عورتوں پر برتری کی طرف اشارہ ہے۔

یہ قرآنی گفتگو اس بات پر گواہ ہے کہ حضرت مریم سلام اللہ علیہا اپنے زمانے میں عظیم ترین منزلت کی مالک خاتون تھیں۔ [2]

قرآن میں حضرت مریم سلام اللہ علیہا سے فرشتوں کی گفتگو کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ انہوں نے حضرت مریم سلام اللہ علیہا کو خدا کی طرف سے برگزیدہ ہونے کی بشارت دینے کے بعد کہا: ''اب پروردگار کے حضور خضوع کرو اور سجدہ و قیام بجالاؤ''۔ [3]

یہ درحقیقت اس عظیم نعمت پر شکرانہ تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا سرآغاز

قرآن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے واقعہ کو اس طرح بیان کرتا ہے:

''آسمانی کتاب قرآن میں مریم سلام اللہ علیہا کی بات کرو کہ جس وقت اس نے اپنے گھر والوں سے جدا ہو کر مشرقی حصہ میں

---

[1] سورہ آل عمران آیت 42

[2] یہ امر بانوئے اسلام حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے بارے میں منقول ان روایات کی نفی نہیں کرتا جن میں ان کے لئے فرمایا گیا ہے کہ آپؑ تمام جہانوں کی عورتوں سے برتر اور افضل ہیں کیونکہ متعدد روایات میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

جناب مریم سلام اللہ علیہا تو اپنے زمانے کی عورتوں کی سردار تھی، لیکن جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اولین و آخرین تمام زمانوں کی عورتوں کی سردار ہیں ''العالمین'' کا لفظ بھی اس بات کے منافی نہیں ہے کیونکہ یہ لفظ قرآن حکیم میں اور دیگر عبارات میں ایسے لوگوں کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو ایک وقت اور ایک زمانے میں زندگی بسر کرتے تھے۔ جیسا کہ بنی اسرائیل کے بارے میں ہے: ''اور میں نے تمہیں عالمین پر فضیلت دی''۔

واضح ہے یہاں مراد یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے مومنین کو اپنے زمانے کے لوگوں پر فضیلت حاصل تھی۔

[3] سورہ آل عمران آیت 43

قیام کیا''۔[1]

درحقیقت وہ ایک ایسی خالی اور فارغ جگہ چاہتی تھی جہاں پر کسی قسم کا کوئی شور وغل نہ ہوتا کہ وہ اپنے خدا سے راز و نیاز میں مشغول رہ سکے، اور کوئی چیز اسے یادِ محبوب سے غافل نہ کرے، اسی مقصد کے لئے اس نے عظیم عبادت گاہ بیت المقدس کی مشرقی سمت کو جو شاید زیادہ آرام وسکون کی جگہ تھی یا سورج کی روشنی کے لحاظ سے زیادہ پاک وصاف اور زیادہ مناسب تھی، انتخاب کیا۔

اس وقت مریم سلام اللہ علیہا نے ''اپنے اور دوسروں کے درمیان ایک پردہ ڈال لیا''۔[2]

تا کہ اس کی خلوت گاہ ہر لحاظ سے کامل ہو جائے۔

بہر حال اس وقت ہم نے اپنی ''روح'' (جو بزرگ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے) اس کی طرف بھیجی اور وہ بے عیب خوبصورت اور کامل انسان کی شکل میں مریم سلام اللہ علیہا کے سامنے ظاہر ہوئی۔[3]

ظاہر ہے ایسے موقع پر مریم سلام اللہ علیہا کی کیا حالت ہوگی۔ وہ مریم سلام اللہ علیہا کہ جس نے ہمیشہ پاکدامنی کی زندگی گزاری، پاکیزہ افراد کے دامن میں پرورش پائی اور تمام لوگوں کے درمیان عفت وتقویٰ کی ضرب المثل تھی، اس پر اس قسم کے منظر کو دیکھ کر کیا گزری ہوگی۔ ایک خوبصورت اجنبی آدمی اس کی خلوت گاہ میں پہنچ گیا تھا۔ اس پر بری وحشت طاری ہوئی۔ فوراً پکاریں کہ ''میں خدائے رحمٰن کی پناہ چاہتی ہوں کہ مجھے تجھ سے بچائے۔ اگر تو پرہیز گار ہے''۔[4]

اور یہ خوف ایسا تھا کہ جس نے مریم سلام اللہ علیہا کے سارے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ خدائے رحمٰن کا نام لینا اور اس کی رحمت عامہ کے ساتھ توصیف کرنا ایک طرف اور اسے تقویٰ اور پرہیز گاری کی تشویق کرنا دوسری طرف، یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ اگر وہ اجنبی آدمی کوئی برا ارادہ رکھتا ہو تو اس پر کنٹرول کرے اور سب سے بڑھ کر خدا کی طرف پناہ لینا، وہ خدا کہ جو انسان کے لئے سخت ترین حالات میں سہارا اور جائے پناہ ہے اور کوئی قدرت اس کی قدرت کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔

حضرت مریم سلام اللہ علیہا یہ بات کہنے کے ساتھ اس اجنبی آدمی کے ردّعمل کی منتظر تھیں۔ ایسا انتظار جس میں بہت پریشانی اور وحشت کا رنگ تھا۔ لیکن یہ حالت زیادہ دیر تک باقی نہ رہی، اس اجنبی نے گفتگو کے لئے زبان کھولی اور اپنی عظیم ذمہ داری اور ماموریت کو اس طرح سے بیان کیا ''اس نے کہا کہ میں تیرے پروردگار کا بھیجا ہوا ہوں''۔[5]

اس جملہ نے اس پانی کی طرح جو آگ پر چھڑکا جائے حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے پاکیزہ دل کو سکون بخشا لیکن یہ سکون زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔

کیونکہ اس نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہا: ''میں اس لئے آیا ہوں کہ تمہیں ایک ایسا لڑکا بخشوں جو جسم وروح

---

[1] سورہ مریم آیت 16

[2] سورہ مریم آیت 17

[3] سورہ مریم آیت 17

اس میں شک نہیں ہے، کہ اس گفتگو کا یہ معنی نہیں ہے کہ جبرائیل صورت اور سیرت کے اعتبار سے بھی ایک انسان میں بدل گیا تھا کیونکہ اس قسم کا انقلاب اور تبدیلی ممکن نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ (بظاہر) انسان کی شکل میں نمودار ہوا، اگرچہ اس کی سیرت وہی فرشتے جیسی تھی، لیکن حضرت مریم سلام اللہ علیہا کو ابتدائی امر میں چونکہ یہ خبر نہیں تھی لہٰذا انہوں نے یہی خیال کیا تھا کہ ان کے سامنے ایک ایسا انسان ہے جو باعتبار صورت بھی انسان ہے اور باعتبار سیرت بھی انسان ہے۔

[4] سورہ مریم ایت 18

[5] سورہ مریم آیت 19

اور اخلاق وعادات کے لحاظ سے پاک و پاکیزہ ہو''۔[1]

یہ بات سنتے ہی مریم سلام اللہ علیہا کانپ اٹھیں وہ پھر ایک گہری پریشانی میں ڈوب گئیں اور ''کہا کہ یہ بات کیسے ممکن ہے کہ میرے کوئی لڑکا ہو حالانکہ کسی انسان نے اب تک مجھے چھوا تک نہیں اور میں ہرگز کوئی بدکار عورت بھی نہیں ہوں''۔[2]

وہ اس حالت میں صرف معمول کے اسباب کے مطابق سوچ رہی تھیں کیونکہ کوئی عورت صاحب اولاد ہو، اس کے لئے صرف دو ہی راستے ہیں یا تو وہ شادی کرے یا بدکاری اور انحراف کا راستہ اختیار کرے، میں تو خود کو کسی بھی دوسرے شخص سے بہتر طور پر جانتی ہوں، نہ تو ابھی تک میرا کوئی شوہر ہے اور نہ ہی میں کبھی منحرف عورت رہی ہوں۔ اب تک تو یہ بات ہرگز سننے میں نہیں آئی کہ کوئی عورت ان دونوں صورتوں کے سوا صاحب اولاد ہوئی ہو۔

لیکن جلدی ہی اس نئی پریشانی کا طوفان بھی پروردگار عالم کے قاصد کی ایک دوسری بات سننے سے تھم گیا اس نے مریم علیہا السلام سے صراحت کے ساتھ کہا: ''مطلب تو یہی ہے کیونکہ تیرے پروردگار نے فرمایا ہے کہ یہ کام میرے لئے سہل اور آسان ہے''۔[3]

تو اچھی طرح میری قدرت سے آگاہ ہے، تو نے تو بہشت کے وہ پھل جو دنیا میں اس فصل میں ہوتے ہی نہیں اپنے محراب عبادت کے پاس دیکھے ہیں، تو نے تو فرشتوں کی وہ آوازیں سنی ہیں جو تیری پاکیزگی کی شہادت کے لئے تھیں۔ تجھے تو یہ حقیقت اچھی طرح معلوم ہے کہ تیرے جد امجد آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا ہوئے۔ پھر یہ کیسا تعجب ہے کہ جو تجھے اس خبر سے ہو رہا ہے۔

اس کے بعد اس نے مزید کہا: ''ہم چاہتے ہیں کہ اسے لوگوں کے لئے آیت اور ایک معجزہ قرار دیں''۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ اسے اپنے بندوں کے لئے اپنی طرف سے رحمت قرار دیں۔ ''بہر حال ''یہ فیصلہ شدہ امر ہے''[4] اور اس میں گفتگوں کی گنجائش نہیں ہے۔

''روح خدا'' سے کیا مراد ہے؟

تقریباً تمام مشہور مفسرین نے یہاں پر روح کی خداوند متعال کے بزرگ فرشتے جبرائیل علیہ السلام سے تفسیر کی ہے اور اسے روح سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ روحانی ہے۔ وہ ایک ایسا وجود ہے جو حیات بخش ہے۔ چونکہ وہ انبیاء و مرسلین کے پاس خداوند متعال کی رسالت کا پہنچانے والا ہے لہٰذا تمام لائق انسانوں کے لئے حیات بخش ہے اور یہاں پر روح کی خدا کی طرف اضافت اس روح کی عظمت و شرافت کی دلیل ہے۔ کیونکہ اضافت کی ایک قسم اضافت تشریفیہ ہے۔

مریم سلام اللہ علیہا سخت طوفانوں کے تھپیڑوں میں

''سرانجام مریم سلام اللہ علیہا حاملہ ہوگئی[5] اور اس موعود بچے نے اس کے رحم میں جگہ پائی''۔

اس بارے میں کہ یہ بچہ کس طرح وجود میں آیا، کیا جبرائیل علیہ السلام نے مریم سلام اللہ علیہا کے پیراہن میں پھونکا یا ان کے منہ

---

[1] سورہ مریم آیت 19
[2] سورہ مریم آیت 20
[3] سورہ مریم آیت 21
[4] سورہ مریم آیت 21
[5] سورہ مریم آیت 22

میں، قرآن مجید میں اس کے متعلق کوئی بات نہیں ہے کیونکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر چہ مفسرین کے اس بارے میں مختلف اقوال ہیں۔

بہر حال ''اس امر کے سبب وہ بیت المقدس سے کسی دور دراز مقام پر چلی گئی''۔[1]

وہ اس حالت میں ایک امید وبیم کے درمیان پریشانی وخوشی کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ وقت گزار رہی تھی، کبھی وہ یہ خیال کرتی کہ آخر کار یہ حمل ظاہر ہو جائے گا، مانا کہ چند یا چند مہینے ان لوگوں سے دور رہ لوں گی اور اس مقام پر ایک اجنبی کی طرح زندگی بسر کرلوں گی مگر آخر کار کیا ہوگا، کون میری بات قبول کرے گا کہ ایک عورت بغیر شوہر کے حاملہ ہوگئی۔ سوائے اس کے کہ اس کا دامن آلودہ ہو، میں اس اتہام کے مقابلہ میں کیا کروں گی۔ واقعاً وہ لڑکی جو سالہا سال سے پاکیزگی وعفت اور تقویٰ و پرہیز گاری کی علامت تھی۔ اور خدا کی عبادت و بندگی میں نمونہ تھی، جس کے بچپنے میں کفالت کرنے پر بنی اسرائیل کے زاہد و عابد فخر کرتے تھے۔ اور جس نے ایک عظیم پیغمبر کے زیر نظر پرورش پائی تھی، خلاصہ یہ ہے کہ جس کے اخلاق کی دھوم اور پاکیزگی کی شہرت ہر جگہ پہنچی ہوئی تھی اس کے لئے یہ بات بہت ہی دردناک تھی کہ ایک دن وہ یہ محسوس کرے کہ اس کا یہ سب معنوی سرمایہ خطرے میں پڑ گیا ہے، اور وہ ایک ایسی تہمت کے گرداب میں پھنس گئی ہے کہ جو بدترین تہمت شمار ہوتی ہے۔ اور یہ تیسرا لرزہ تھا کہ جو اس کے جسم پر طاری ہوا۔

لیکن دوسری طرف وہ یہ محسوس کرتی تھی کہ یہ فرزند خداوند تعالیٰ کا موعود پیغمبر ہے۔ یہ ایک عظیم آسمانی تحفہ ہوگا، وہ خدا کہ جس نے مجھے ایسے فرزند کی بشارت دی ہے اور ایسے معجزانہ طریقے سے اسے پیدا کیا ہے مجھے اکیلا کیسے چھوڑے گا؟ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اس قسم کے اتہام کے مقابلہ میں میرا دفاع نہ کرے؟ میں نے تو اس کے لطف وکرم کو ہمیشہ آزمایا ہے اور اس کا دست رحمت ہمیشہ اپنے سر پر دیکھا ہے۔

اس بات پر کہ مریم سلام اللہ علیہا کی مدت حمل کس قدر تھی، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، اگر چہ قرآن میں سربستہ طور پر بیان ہوا ہے (پھر بھی) بعض نے اسے ایک گھنٹہ، بعض نے نو گھنٹے بعض نے چھ ماہ بعض نے سات ماہ بعض نے آٹھ ماہ اور بعض نے دوسری عورتوں کی طرح نو مہینے کہا ہے، لیکن یہ موضوع اس وقعے کے مقصد پر اثر نہیں رکھتا۔ روایات بھی اس سلسلہ میں مختلف ہیں۔

اس بارے میں کہ یہ جگہ ''اقصیٰ'' (دور دراز) کہاں تھی، بہت سے لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ یہ شہر ''ناصرہ'' تھا اور شاید اس شہر میں بھی وہ مسلسل گھر ہی میں رہتی تھیں اور بہت کم باہر نکلتی تھیں۔

جو کچھ بھی تھا مدت حمل ختم ہوگئی اور مریم سلام اللہ علیہا کی زندگی کے طوفانی لمحات شروع ہو گئے انہیں سخت دردزہ کا آغاز ہو گیا۔ ایسا درد جو انہیں آبادی سے بیابان کی طرف لے گیا۔ ایسا بیابان جو انسانوں سے خالی، خشک اور بے آب تھا۔ جہاں کوئی جائے پناہ نہ تھی۔

اگر چہ اس حالت میں عورتیں اپنے قریبی اعزاء کی پناہ لیتی ہیں تا کہ وہ بچے کی پیدائش کے سلسلے میں ان کی مدد کریں، لیکن مریم سلام اللہ علیہا کی حالت چونکہ ایک استثنائی کیفیت تھی، وہ ہرگز نہیں چاہتی تھیں کہ کوئی ان کے وضع حمل کو دیکھے، لہٰذا دردزہ کے شروع ہوتے ہی انہوں نے بیابان کی راہ لی۔

قرآن اس سلسلے میں کہتا ہے: ''وضع حمل کا وہ درد اسے کھجور کے درخت کے پاس کھینچ لے گیا''۔[2] قرآن میں ''جذع

---

[1] سورہ مریم آیت 22

[2] سورہ مریم آیت 23

النخلة، کالفظ استعمال ہوا ہے، اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ ''جذع'' درخت کے تنا کے معنی میں ہے، یہ نشاندہی کرتا ہے کہ: اس درخت کا صرف تنا باقی رہ گیا تھا یعنی وہ خشک شدہ درخت تھا۔

اے کاش اس سے پہلے ہی مرگئی ہوتی!

اس حالت میں غم واندوہ کا ایک طوفان تھا جو مریم سلام اللہ علیہا کے پورے وجود پر طاری تھا، انہوں نے محسوس کیا کہ جس لمحے کا خوف تھا وہ آن پہنچا ہے ایسا لحظہ کہ جس میں وہ سب کچھ آشکار ہوجائے گا جو اب تک چھپا ہوا ہے اور بے ایمان لوگوں کی طرف سے ان پر تہمت کے تیروں کے بارش شروع ہوجائے گی۔

یہ طوفان اس قدر سخت تھا اور یہ باران کے دوش پر اتنا سنگین تھا کہ بے اختیار ہوکر بولیں: ''اے کاش میں اس سے پہلے ہی مرگئی ہوتی اور بالکل بھلادی جاتی'' [۱]

یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ حضرت مریم سلام اللہ علیہا کو صرف آئندہ کی تہمتوں کا خوف ہی نہیں تھا کہ جو ان کے دل کو بے چین کیے ہوئے تھا، بلکہ انہیں سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ دوسری مشکلات بھی تھیں۔ کسی دایہ اور ہمدم و مددگار کے بغیر وضع حمل، سنسان بیابان میں بالکل تنہائی، آرام کے لئے کوئی جگہ نہ ہونا، پینے کے لئے پانی اور کھانے کے لئے غذا کا فقدان اور نومولود کے لئے نگہداشت کے کسی وسیلے کا نہ ہونا یہ ایسے امور تھے کہ جنہوں نے انہیں سخت پریشان کررکھا تھا۔ اور وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت مریم سلام اللہ علیہا نے ایمان اور توحید کی ایسی معرفت کے ہوتے ہوئے اور خداوند متعال کے اتنے لطف وکرم اور احسانات دیکھنے کے باوجود ایسا جملہ زبان پر کیسے جاری کیا کہ ''اے کاش میں مرگئی ہوتی اور فراموش ہوچکی ہوتی'' انہوں نے اس وقت میں جناب مریم سلام اللہ علیہا کی حالت کا تصور ہی نہیں کیا۔ اور وہ خود ان مشکلات میں سے کسی چھوٹی سی مشکل میں بھی گرفتار ہوجائیں تو ان کے ایسے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے کہ انہیں خود اپنی بھی خبر نہ رہے گی اور وہ خود کو بھی بھول جائیں گے۔

لیکن یہ حالت زیادہ دیر تک باقی نہ رہی اور امید کا وہی روشن نقطہ جو ہمیشہ ان کے دل کی گہرائیوں میں رہتا تھا چمکنے لگا ''یکا یک ایک آواز ان کے کانوں میں آئی جو ان کے پاؤں کے نیچے سے بلند ہورہی تھی کہ غمگین نہ ہو، ذرا غور سے دیکھ تیرے پروردگار نے تیرے پاؤں کے نیچے ایک خوشگوار پانی کا چشمہ جاری کردیا ہے''۔ [۲]

ایک نظر اپنے سر کے اوپر ڈالو اور غور سے دیکھو کہ کس طرح خشک تنہ بار آور کھجور کے درخت میں تبدیل ہوگیا ہے، کہ پھلوں نے اس کی شاخوں کو زینت بخشی ہے'' اور اس کھجور کو ہلاؤ تا کہ تازہ کھجوریں تم پر گرنے لگیں۔ اس لذیذ اور قوت بخش غذا میں سے کھاؤ اور اس کے خوشگوار پانی میں سے پیو۔ اور اپنی آنکھوں کو اس نومولود سے روشن رکھو۔ اور اگر آئندہ کے حالات سے پریشانی ہے تو مطمئن رہو، جب تم کسی بشر کو دیکھو اور وہ تم سے اس بارے میں وضاحت چاہے تو اشارہ کے ساتھ اس سے کہہ دینا کہ میں نے خدائے رحمٰن کے لئے روزہ رکھا ہوا ہے، خاموشی کا روزہ اور اس سبب سے میں آج کسی سے بات نہیں کروں گی''۔ [۳]

خلاصہ یہ ہے کہ تمہیں اس بات کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ تم آپ اپنا دفاع کرو، وہ ذات کہ جس نے یہ مولود تمہیں عطا کیا ہے، اس نے تیرے دفاع کی ذمہ داری بھی اپنے ذمہ لی ہے اس لئے تم ہر طرح سے مطمئن رہو اور غم واندوہ کو اپنے دل میں جگہ نہ

[۱] سورہ مریم آیت 23

[۲] سورہ مریم آیت 24

[۳] سورہ مریم آیت 25 تا 26

دو۔ان پے در پے واقعات نے جو ایک انتہائی تاریک فضا میں روشن شعلوں کی طرح چمکنے لگے تھے،ان کے دل کو پوری طرح روشن کر دیا تھا اور انہیں ایک سکون بخش دیا تھا۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی گہوارے میں باتیں

''آخر کار حضرت مریم سلام اللہ علیہا اپنے بچے کو گود میں لئے ہوئے بیابان سے آبادی کی طرف لوٹیں اور اپنی قوم اور رشتہ داروں کے پاس آئیں''۔[1]

جونہی انھوں نے ایک نومولود بچہ ان کی گود میں دیکھا تعجب کے مارے ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا،وہ لوگ کہ جو مریم سلام اللہ علیہا کی پاکدامنی سے اچھی طرح واقف تھے اور ان کے تقویٰ وکرامت کی شہرت کو سن چکے تھے،سخت پریشان ہوئے،یہاں تک کہ ان میں سے کچھ تو شک وشبہ میں پڑ گئے اور بعض ایسے لوگ کہ جو فیصلہ کرنے میں جلد باز تھے انھوں نے اسے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا اور کہنے لگے اس بدکاری کے ساتھ تمہارے روشن ماضی پر بہت افسوس اور صد افسوس اس پاک خاندان پر کہ جو اس طرح بدنام ہوا'' کہنے لگے:اے مریمؑ تو نے یقیناً بہت ہی عجیب اور بُرا کام انجام دیا ہے''۔[2]

بعض نے ان کی طرف رخ کیا اور کہا:''اے ہارون کی بہن تیرا باپ تو کوئی بُرا آدمی نہیں تھا اور تیری ماں بھی بدکار نہیں تھی''۔[3]

ایسے پاک و پاکیزہ ماں باپ کے ہوتے ہوئے ہم یہ تیری کیا حالت دیکھ رہے ہیں،تو نے اپنے باپ کے طریقہ اور ماں کے چلن میں کون سی بُرائی دیکھی تھی کہ تو نے اس سے روگردانی کر لی۔[4]

اس وقت جناب مریم سلام اللہ علیہا نے خداوند متعال کے حکم سے خاموشی اختیار کی،صرف ایک کام جو انھوں نے انجام دیا یہ تھا کہ اپنے نومولود بچے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا۔

لیکن اس کام نے ان کے تعجب کو اور بھی برانگیختہ کر دیا اور شاید ان میں سے بعض نے اس بات کو ان کے ساتھ ٹھٹھہ کرنے پر محمول کیا اور وہ غصے میں آ کر بولے:اے مریمؑ ایسا کام کر کے تو اپنی قوم کا مذاق اڑا رہی ہے۔

بہرحال انھوں نے اس سے کہا:''ہم ایسے بچے کے ساتھ جو کہ ابھی گہوارے میں ہے کیسے باتیں کریں''۔[5]

بہرحال وہ لوگ اس کی بات سن کر پریشان ہو گئے،بلکہ شاید غضب ناک ہو گئے،جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک دوسرے سے یہ کہا کہ اس تمسخر اور استہزاء کرنا،جادہ عفت و پاکدامنی سے اس کے انحراف کی نسبت ہمارے لئے زیادہ سخت اور سنگین تر ہے۔لیکن یہ حالت زیادہ دیر تک قائم نہ رہی،کیونکہ اس نومولود بچے نے بات کرنے کے لئے زبان کھولی اور کہا:

---

[1] سورہ مریم آیت27

[2] سورہ مریم آیت27

[3] سورہ مریم آیت28

[4] یہ بات کہ جو انھوں نے مریم سلام اللہ علیہا سے کہی کہ''اے ہارون کی بہن''مفسرین کے درمیان مختلف تفاسیر کا موجب بنی ہے،لیکن جو بات سب سے زیادہ صحیح نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہارون ایک ایسا پاک وصالح آدمی تھا کہ وہ بنی اسرائیل کے درمیان ضرب المثل ہو گیا تھا۔
وہ جس شخص کا پاکیزگی کے ساتھ تعارف کروانا چاہتے تھے تو اس کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ ہارون کا بھائی ہے یا ہارون کی بہن ہے،مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں اس معنی کو ایک مختصر حدیث میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے

[5] سورہ مریم آیت29

''میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے آسمانی کتاب مرحمت فرمائی ہے، اور مجھے پیغمبر قرار دیا ہے''۔

''اور خدا نے ایک بابرکت وجود قرار دیا ہے، خواہ میں کہیں بھی ہوں، میرا وجود بندوں کے لئے ہر لحاظ سے مفید ہے''۔

''اور اس نے مجھے تاحیات نماز پڑھتے رہنے اور زکوٰۃ دینے کی وصیت کی ہے''۔

''اور اس کے علاوہ مجھے اپنی والدہ کے بارے میں نیکوکار، قدردانی کرنے والا اور خیر خواہ قرار دیا ہے''۔

''اور اس نے مجھے جبار و شقی قرار نہیں دیا ہے''۔ [1]

آخر میں یہ نومولود کہتا ہے: ''خدا کا مجھ پر سلام و درود ہو اس دن کہ جب میں پیدا ہوا اور اس دن جب میں مروں گا اور اس دن کہ جب میں زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا''۔ [2]

یہ تین دن انسان کی زندگی میں ـــــ زندگی ساز اور خطرناک دن ہیں کہ، جن میں سوائے لطف خدا کے سلامتی میسر نہیں ہوتی، اسی لئے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی یہ جملہ آیا ہے اور حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کے بارے میں بھی، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ پہلے موقع پر خداوند متعال نے یہ بات کہی ہے اور دوسرے موقع پر حضرت مسیح علیہ السلام نے یہ تقاضا کیا ہے۔ [3]

یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا علمی لحاظ سے یہ بات ممکن ہے کہ باپ کے بغیر بچہ پیدا ہو، کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا صرف اکیلی ماں سے پیدا ہونے کا مسئلہ، اس بارے میں سائنس دانوں کی تحقیقات کے مخالف نہیں ہے؟

اس میں شک نہیں کہ یہ کام معجزانہ طور پر ظہور پذیر ہوا تھا، لیکن موجودہ زمانے کا علم اور تحقیق اس قسم کے امر کے امکان کی نفی نہیں کرتا، بلکہ اس کے ممکن ہونے کی تصریح کرتا ہے۔

خاص طور پر نر کے بغیر بچہ پیدا ہونا بہت سے جانوروں میں دیکھا گیا ہے، اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ نطفے کے انعقاد کا مسئلہ صرف انسانوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے، اس امر کے امکان کو عمومی حیثیت سے ثابت کرتا ہے۔

''ڈاکٹر الکسیس کارل''، مشہور فرانسیسی ''فزیالوجسٹ'' اور حیات شناس اپنی کتاب ''انسان موجود ناشناختہ'' میں لکھتا ہے:

جس وقت ہم اس بارے میں غور کرتے ہیں کہ تولید مثل میں ماں اور باپ کا کتنا کتنا حصہ ہے تو ہمیں ''لوب'' اور ''باٹایون'' کے تجربوں کو بھی نظر میں رکھنا چاہئے کہ قورباغہ کے بارور نہ ہوتے ہوئے چھوٹے سے تخم کو ''سپرماٹوز'' کے دخل کے بغیر ہی خاص ٹکنیک کے ذریعہ ایک جدید قورباغہ کو وجود میں لایا جاسکتا ہے۔

اس ترتیب سے کہ ممکن ہے کہ کیمسٹری یا فزکس کے ایک عامل کو ''نرسل'' کا جانشین بنا دیا جائے لیکن ہر حالت میں ہمیشہ ایک عامل مادہ کا وجود ضروری ہے۔

اس بناء پر وہ چیز کہ جو سائنسی لحاظ سے بچے کے تولد میں قطعیت رکھتی ہے وہ ماں کے نطفہ ''اوول'' کا وجود ہے، ورنہ نر کے نطفہ (سپرماٹوزا) کی جگہ پر دوسرا عامل کو جانشین بنایا جاسکتا ہے، اسی بناء پر نر کے بغیر بچے کی پیدائش کا مسئلہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو آج کی دنیا میں ڈاکٹروں کے نزدیک قابل قبول قرار پا چکی ہے، اگرچہ ایسا اتفاق شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔

ان سب سے قطع نظر یہ مسئلہ خداوند متعال کے قوانین آفرینش کے سامنے ایسا ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے: عیسیٰ کی مثال خدا

---

[1] سورہ مریم آیت 30 تا 32 ''جبار اس شخص کو بھی کہتے ہیں کہ جو غیظ و غضب کے عالم میں لوگوں کو مارتا اور نابود کرتا ہو، اور فرمان عقل کی پیروی کرتا ہو۔

[2] سورہ مریم آیت 33

[3] باکرہ سے بچہ پیدا ہونا

کے نزدیک آدم جیسی ہے کہ اسے مٹی سے پیدا کیا پھر اس کو حکم دیا کہ ہو جا تو وہ بھی ایک کامل موجود ہو گیا۔[1]

یعنی یہ خارق العادۃ اس خارق العادۃ سے زیادہ اہم نہیں ہے نوزائیدہ بچہ کس طرح بات کر سکتا ہے؟

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ: کوئی نوزائیدہ بچہ تولد کے ابتدائی گھنٹوں یا دنوں میں بات نہیں کرتا، کیونکہ بات کرنا دماغ کی کافی نشوونما اور اس کے بعد زبان وحنجرہ کے عضلات کا بڑھنا اور انسانی بدن کے مختلف اعضاء کی ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی کا محتاج ہے، اور ان امور کے لئے حسب معمول کئی مہینے گزرنے چاہئیں تا کہ یہ بتدریج اور آہستہ آہستہ بچوں میں فراہم ہوں۔

لیکن پھر بھی کوئی علمی دلیل اس امر کے محال ہونے پر ہمارے پاس نہیں ہے، صرف یہ ایک غیر معمولی کام ہے اور تمام معجزات اسی قسم کے ہوتے ہیں یعنی سب ہی غیر معمولی کام ہوتے ہیں نہ کہ محال عقلی۔

جناب عیسیٰ علیہ السلام کی ماموریت کا آغاز

جو افراد خدا کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کے لئے مامور ہوتے ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ پہلے مرحلے میں علم ودانش کے ذریعے لوگوں کو دعوت دیں، اور زندہ وانسان ساز آئین وقوانین پیش کریں، پھر دوسرے مرحلے میں خدا سے اپنے ارتباط کے لئے واضح اسناد دکھائیں اور یوں خدا کی طرف سے منسوب ہونے کا ثبوت پیش کریں۔

اس مقصد کے لئے ہر پیغمبر اپنے زمانے کے ترقی یافتہ علوم کی قسم کے معجزے سے لیس ہوتا ہے تا کہ جہان ماوراء طبیعت سے ان کا ارتباط زیادہ واضح ہو جائے اور ہر زمانے کے علماء ان کے مقابلے میں اپنے عجز کی وجہ سے ان کی دعوت کی حقانیت کا اعتراف کریں۔

یہ بات ایک حدیث میں حضرت علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام سے منقول ہے، ان سے سوال کیا گیا تھا: ہر پیغمبر کے پاس کچھ نہ کچھ معجزات کیوں ہوتے تھے، اس سوال کے جواب میں آپ نے وضاحت فرمائی جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

''حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جادوگر بہت زیادہ دستے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسا عمل انجام دیا جس کے مقابلے میں تمام جادوگر عاجز آ گئے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانے میں اور دعوت کے موقع پر اطباء بیماروں کے علاج میں مہارت رکھتے تھے، لہٰذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی بیماروں کو مادی مسائل کے بغیر شفاء دیکر اپنی حقانیت کو ثابت کر دیتے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں خطبائ، شعراء اور سخنور بہت زیادہ فصاحت وبلاغت کے مالک تھے اور ان سب نے قرآنی فصاحت وبلاغت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔

قرآن میں حضرت مسیح علیہ السلام کی ماموریت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خداوند عالم نے پہلے فرمایا ہے: ''خدا نے اسے کتاب وحکمت کی تعلیم دی'' اور اس کے بعد کتاب وحکمت کے مصداق کی نشاندہی کی گئی ہے۔ فرمایا: ''توریت وانجیل سکھائی''، اور اس کے بعد بنی اسرائیل کے منحرف لوگوں کی ہدایت کے لئے ان کی ماموریت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، کیونکہ وہ ان دنوں طرح طرح کے خرافات، آلودگیوں اور اختلافات میں گرفتار تھے، فرمایا: ''ہم نے ان کو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجا''۔[2]

معجزات عیسیٰ علیہ السلام

درحقیقت انبیاء کی دعوت حقیقی زندگی کی طرف دعوت ہے اس لئے قرآن میں حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزات کی تفصیل کے

---

[1] سورہ آل عمران 59

[2] سورہ آل عمران آیت 49

موقع پر سب سے پہلے حکم خدا سے بے جان چیزوں میں زندگی پیدا کرنے کا تذکرہ ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی فرمایا گیا ہے:
''میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لئے نشانی لایا ہوں، میں گیلی مٹی سے پرندے کی شکل کی کوئی چیز بناتا ہوں اور اس میں پھونکتا ہوں تو وہ حکم خدا سے پرندہ بن جاتا ہے''۔ [1]

حکم خدا سے ایجاد حیات کا مسئلہ کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ دنیا کے تمام زندہ موجودات مٹی اور پانی سے وجود میں آئے ہیں،

زیادہ سے زیادہ اسے تدریجی تحول وتغیر کہہ سکتے ہیں اور یہ تبدیلی عرصہ دراز میں وقوع پذیر ہو جائیں اور مٹی زندہ موجود میں بدل جائے۔ جب کہ یہ معجزہ پیش کرنے والے کا ربط ماوراء الطبیعات اور پروردگار کی لامتناہی قدرت کے ساتھ ہے۔

اس کے بعد ان بیماریوں کے علاج کا تذکرہ ہے جن کا علاج بہت مشکل ہے یا جو معمول کے طریقوں سے قابل علاج نہیں ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: ''میں مادر زاد اندھے اور ابرص (برص اور سفید داغ والی بیماری) میں مبتلا لوگوں کا علاج کر سکتا ہوں اور مردوں کو بھی لباس حیات پہنا سکتا ہوں''۔ [2]

واضح ہے کہ یہ امور خصوصاً اس زمانے کے اطباء اور علماء کے لئے ناقابل انکار معجزات تھے۔

بعد کے مرحلے میں لوگوں کے پوشیدہ اسرار کی خبر دینے کی بات کی گئی ہے کیونکہ ہر شخص کی اپنی انفرادی اور شخصی زندگی سے کچھ ایسے اسرار اور راز ہوتے ہیں جن سے دوسرے لوگ آگاہ نہیں ہوتے۔ اب اگر کوئی شخص کسی قسم کے سابقہ روابط کے بغیر ایسے امور کی اطلاع دے دے مثلاً جو کھانے انہوں نے کھائے ہیں ان کی خبر دے یا جو کچھ انہوں نے پس انداز کر رکھا ہے اس کی تمام تفصیلات بتا دے تو یہ اس امر کی دلیل ہوگی کہ اس نے غیبی منبع عالم سے الہام حاصل کیا ہے، جناب مسیح علیہ السلام کہتے ہیں: ''میں ان امور سے آگاہ ہوں اور تمہیں ان کی خبر دیتا ہوں''۔ [3]

تفسیر المنار کے مؤلف اور بعض دیگر مفسرین اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ قرآن میں مذکورہ معجزاتی امور جو حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں قرآن نے بیان کیے ہیں ان کی کچھ نہ کچھ توجیہ کی جانا چاہئے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو فقط دعویٰ کیا تھا کہ میں حکم خدا سے ایسا کر سکتا ہوں لیکن عملی طور پر یہ کام ہرگز انجام نہیں دیئے حالانکہ اگر فرض کریں کہ اس آیت میں یہ احتمال ہو پھر بھی سورہ مائدہ آیت (110) میں ہے:

''وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ''۔

''(اے عیسیٰ) خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت تم پر یہ بھی تھی کہ تم گیلی مٹی سے پرندہ بناتے تھے، اس میں پھونکتے تھے اور وہ حکم خدا سے زندہ ہو جاتا تھا''

لہٰذا مندرجہ بالا دلیل قابل قبول نہیں کیونکہ سورہ مائدہ کی مذکورہ آیت میں تو پوری صراحت سے ان کے عملاً کر گزرنے کا ذکر ہے۔

---

[1] سورہ آل عمران آیت 49

[2] سورہ آل عمران آیت 49

[3] کیا یہ معجزات باعث تعجب ہیں؟

علاوہ ازیں ایسی توجیہات پر اصرار کے لئے کوئی وجہ بھی نہیں کیونکہ اگر مراد انبیاء کے خارق العادۃ افعال کا انکار ہے تو قرآن نے بہت سے مواقع پر اس کی تصریح کی ہے اور بالفرض ایک آدھ جگہ پر توجیہ کر بھی لیں تو بقیہ مواقع پر کیا کیا کریں گے۔

ان سب پہلوؤں سے صرف نظر کرتے ہوئے جب ہم خدا کو تمام قوانین فطرت وطبیعت پر حاکم جانتے ہیں نہ کہ ان کا محکوم، تو پھر کیا مانع ہے کہ اس کے حکم سے استثنائی مواقع پر طبیعت کے معمول کے قوانین میں غیر معمولی طریقے سے تبدیلی وقوع پذیر ہوجائے۔ اگر وہ یہ تصور کرتے ہیں کہ یہ امر خدا کی توحید افعالی، کی خالقیت اور لاشریک ہونے کے ساتھ سازگار نہیں ہیں تو قرآن نے اس کا جواب دیا ہے کیونکہ تمام جگہوں پر ان واقعات کے وقوع کو حکم خدا سے مشروط قرار دیا ہے یعنی کوئی شخص بھی اپنی ذاتی قوت و طاقت کے ذریعے ایسے کاموں میں ہاتھ نہیں ڈال سکتا مگر یہ کہ حکم خدا اور اس کی بے پایاں قدرت کو منظور ہو اور یہ عین توحید ہے شرک نہیں۔

میں خدا کا بندہ ہوں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہر قسم کے ابہام اور اشتباہ کے خاتمے کے لئے اور اس لئے کہ آپ کی استثنائی ولادت کو آپؑ کی الوہیت پر سند نہ سمجھ لیں بار بار کہتے تھے: ''اللہ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے'' نیز کہتے: ''میں اس کا بندہ ہوں اور اس کا بھیجا ہوا ہوں''۔ [1]

اس کے برخلاف موجودہ تحریف شدہ انجیلوں میں حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان سے خدا کے بارے میں باپ کا لفظ نقل کیا گیا ہے، قرآن میں ایسے مقامات پر لفظ ''رب'' یا اس جیسے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

''ان اللہ ربی و ربکم''۔

اور یہ چیز دعوائے الوہیت کے خلاف اور اس کے مقابلے میں حضرت مسیح علیہ السلام کی انتہائی توجہ کی نشاندہی کرتی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عیسائیوں کی گفتگو

نجران کے عیسائیوں کے سوال کے جواب کے طور پر وحی نازل ہوئی، وہ ایک ساٹھ رکنی وفد کی صورت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس مدینہ میں آئے۔ اس میں ان کے چند نمائندہ روسا اور بزرگ شامل تھے۔

انہوں نے جو مسائل پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش کئے ان میں سے ایک مسئلہ یہ تھا کہ وہ پوچھنے لگے کہ آپ ہمیں کس چیز کی طرف دعوت دیتے ہیں؟۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خدائے یگانہ کی طرف اور یہ کہ میں اس کی طرف سے ہدایت مخلوق کی خاطر رسالت کے منصب پر فائز ہوں۔ نیز یہ کہ مسیح علیہ السلام اس کے بندوں میں سے ایک تھے، حالات بشری رکھتے تھے اور دوسرے لوگوں کی طرح غذا کھاتے تھے۔

انہوں نے یہ بات نہ مانی اور باپ کے بغیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے ان کی الوہیت کے لئے دلیل کے طور پر پیش کیا۔ اس پر وحی الٰہی نازل ہوئی۔

درحقیقت قرآن کا یہ ایک مختصر اور واضح استدلال ہے جس میں نجران کے عیسائیوں کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں دعویٰ الوہیت کا جواب ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام باپ کے بغیر پیدا ہوئے تو یہ امر اس کی دلیل کبھی نہیں بن سکتا کہ وہ خدا کے بیٹے یا خود خدا تھے، کیونکہ یہ بات تو حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں عجیب ترین صورت میں محقق اور ثابت ہوچکی ہے۔ وہ تو

---

[1] سورہ آل عمران آیت 51

ماں باپ دونوں کے بغیر دنیا میں آئے تھے، اس لئے جیسے حضرت آدم کی مٹی سے پیدائش کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اور وہ خدا جو کام انجام دینا چاہے اس کا فعل اور ارادہ ہم آہنگ ہیں، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی والدہ سے بغیر باپ کے پیدا ہونا کوئی محال مسئلہ نہیں ہے، بلکہ حضرت آدم کی پیدائش کئی لحاظ سے زیادہ تعجب خیز ہے، پس اگر بغیر باپ کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ان کی الوہیت کی دلیل ہے تو حضرت آدم اس امر کے زیادہ مستحق ہیں۔

خیالی تثلیث

قرآن میں کفار اور اہل کتاب کے بارے میں جاری مباحث کے حوالے سے مسیحی معاشرے کے اہم ترین انحراف کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ ہے تثلیث یا تین خداؤں کا مسئلہ۔

مختصر سے استدلالی جملوں کے ساتھ انھیں اس عظیم انحراف کے انجام بد سے ڈرایا گیا ہے۔

قرآن پہلے انہیں خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ''اپنے دین میں غلو کی راہ نہ چلو اور حق کے علاوہ خدا کے بارے میں کچھ نہ کہو۔''[1]

تثلیث اور الوہیت مسیح علیہ السلام کا ابطال اس سلسلے میں چند نکات پیش خدمت ہیں:

1۔ عیسیٰ علیہ السلام مریم کے بیٹے ہیں:

قرآن حکیم میں عیسیٰ علیہ السلام کا نام ان کی والدہ کے نام کے ساتھ سولہ مرتبہ آیا ہے یعنی ''عیسیٰ علیہ السلام صرف مریم کے بیٹے ہیں'' یہ اس بات کی نشاندہی ہے کہ مسیح علیہ السلام بھی دیگر انسانوں کی طرح رحم مادر میں رہے اور ان پر بھی جنین کا دور گذرا وہ دیگر انسانوں کی طرح پیدا ہوئے، دودھ پیا اور آغوش مادری میں پرورش پائی۔

یعنی تمام بشری صفات ان میں موجود تھیں۔ لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ ایسا شخص جو قوانین طبیعت اور عالم مادہ کا متمول و محکوم ہو، وہ خدائے ازلی و ابدی بن جائے۔

خصوصاً لفظ ''انما'' جو قرآن میں آیا ہے وہ اس وہم کا جواب ہے کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کا باپ نہیں تو اس کا یہ معنی نہیں کہ وہ خدا کا بیٹا ہے بلکہ وہ صرف اور صرف مریم سلام اللہ علیہا کا بیٹا ہے۔

2۔ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے رسول ہیں:

عیسیٰ علیہ السلام خدا کے فرستادہ اور رسول ہیں ''رسول اللہ''، عیسیٰ علیہ السلام کا یہ مقام اور حیثیت بھی ان کی الوہیت سے مناسبت نہیں رکھتا۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مختلف باتیں جن میں سے کچھ اناجیل موجودہ میں بھی ہیں، سب کی سب انسانی ہدایت کے لئے ان کی نبوت و رسالت کی حکایت کرتی ہیں نہ کہ ان کی الوہیت اور خدائی کی۔

3۔ عیسیٰ علیہ السلام خدا کا کلمہ ہیں:

عیسیٰ علیہ السلام خدا کا کلمہ ہیں جو مریم سلام اللہ علیہا کی طرف القاء ہوا۔ قرآن کی چند آیات میں عیسیٰ علیہ السلام کو کلمہ کہا گیا ہے، یہ تعبیر مسیح کے

---

[1] سورہ نساء آیت 171

مخلوق ہونے کی طرف اشارے کے لئے ہے جیسے ہمارے کلمات، ہماری مخلوق اور ایجاد ہیں، اسی طرح عالم آفرینش کے موجودات بھی خدا کی مخلوق ہیں۔ نیز جیسے ہمارے کلمات ہمارے اندرونی اسرار کا مظہر ہوتے ہیں اور ہمارے جذبات وصفات کے ترجمان ہوتے ہیں اسی طرح مخلوقات عالم بھی خدا کی صفات جمال وجلال کو واضح کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آیات قرآنی میں متعدد مقامات پر تمام مخلوقات کے لئے لفظ ''کلمہ'' استعمال کیا گیا ہے۔ [1]

البتہ یہ کلمات آپس میں مختلف ہیں، بعض بہت اہم اور بلند ہیں اور بعض نسبتاً معمولی اور کم تر ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آفرینش کے لحاظ سے خصوصیت کے ساتھ مقام رسالت کے علاوہ یہ امتیاز بھی رکھتے تھے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا کئے گئے۔

4۔ عیسیٰ علیہ السلام روح ہیں:

جنہیں خدا نے پیدا کیا ہے، یہ تعبیر قرآن حکیم میں حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں بھی آئی ہے۔ ایک معنی کے لحاظ سے تمام نوع انسانی کے بارے میں ہے یہ اس روح کی عظمت کی طرف اشارہ ہے جسے خدا نے دیگر انسانوں میں عموماً اور حضرت مسیح علیہ السلام اور باقی انبیاء میں خصوصیت سے پیدا کیا۔

علاوہ ازیں یہ امر تعجب خیز ہے کہ عیسائی حضرات، والد کے بغیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کو ان کی الوہیت کی دلیل قرار دیتے ہیں حالانکہ وہ بھول جاتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے اس مخصوص خلقت کو کوئی بھی ان کی الوہیت کی دلیل نہیں سمجھتا۔

اس بیان کے بعد قرآن کہتا ہے: ''اب جبکہ ایسا ہے تو خدائے یگانہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لے آؤ اور یہ نہ کہو کہ تین خدا ہیں اور اگر اس بات سے اجتناب کرو، اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے''۔ [2]

یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انتظار میں

اہل یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیشن گوئی اور بشارت کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور کے منتظر تھے۔ لیکن جب انہوں نے ظہور فرمایا اور بنی اسرائیل کے ایک ستمگر اور منحرف گروہ کو اپنے منافع خطرے میں نظر آئے تو صرف تھوڑے سے لوگ آپ کے گرد جمع ہوئے اور جن لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت قبول کرنے اور احکام کی پیروی سے ان کی حیثیت اور قدر ومنزلت خطرے سے دوچار ہو جائے گی انہوں نے قوانین الٰہی کو قبول کرنے سے منہ پھیر لیا۔ دلیل وبرہان سے انہیں کافی دعوت دینے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس نتیجے پر پہنچے کہ بنی اسرائیل کا ایک گروہ مخالفت اور گناہ پر مصر ہے اور وہ کسی انکار اور کج روی سے دستبردار نہیں ہوگا، لہٰذا انہوں نے پکار کر کہا: ''کون ہے جو دین خدا کی حمایت اور میرا دفاع کرے؟''۔ [3]

صرف تھوڑے سے افراد نے اس کا مثبت جواب دیا۔ یہ چند پاک باز افراد تھے جنہیں قرآن نے ''حواریین'' کا نام دیا ہے۔

انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی پکار کا جواب دیا اور ہر لحاظ کی مدد کی ان کے مقدس مقاصد کی پیش رفت کی راہ میں دفاع

---

[1] مثلاً سورہ کہف آیت 109، سورہ لقمان آیت 29

[2] سورہ نساء آیت 171

[3] سورہ آل عمران آیت 52

کرنے سے دریغ نہ کیا۔

حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہر طرح سے مدد کا اعلان کیا اور جیسا کہ قرآن نے ان سے نقل کیا ہے، کہنے لگے: ''ہم خدا کے یاور و مددگار ہیں، خدا پر ایمان لائے ہیں اور آپؑ کو اپنے اسلام پر گواہ بناتے ہیں''۔ [1]

یہ امر قابل توجہ ہے کہ حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں یہ نہیں کہا کہ ہم آپؑ کے مددگار ہیں بلکہ اپنی انتہائی توحید پرستی اور خلوص کے ثبوت کے لئے اور اس مقصد کے لئے کہ ان کی بات سے کسی شرک کی بو نہ آئے، وہ کہنے لگے: ہم خدا کے مددگار اور ساتھی ہیں اور اس کے دین کی مدد کریں گے اور آپؑ کو اس حقیقت پر گواہ بناتے ہیں۔ گویا وہ بھی یہ محسوس کرتے تھے کہ منحرف اور کج رو افراد آئندہ حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت کا دعویٰ کریں گے لہٰذا وہ ان کے ہاتھوں میں کوئی دلیل نہیں دینا چاہتے تھے۔

حواری کون تھے؟

''حواریین'' ''حواری'' کی جمع ہے اس کا مادہ ''حور'' ہے جس کا معنی ہے ''دھونا اور سفید کرنا'' ہے، کبھی کبھی یہ لفظ ہر سفید چیز کے لئے بھی بولا جاتا ہے اسی لئے سفید غذا کو عرب لوگ ''حواری'' کہتے ہیں۔ بہشت کی حوروں کو بھی ان کے سفید رنگ کی وجہ سے ''حور'' کہتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شاگردوں کو ''حواری'' کیوں کہا گیا، اس کے لئے بہت سے احتمالات پیش کیے گئے ہیں مگر جو چیزیں زیادہ قریب عقل ہے اور دین کے عظیم رہبروں سے منقول احادیث میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے یہ ہے کہ وہ پاک دل لوگ تھے اور روح باصفا کے مالک تھے اس کے علاوہ وہ دوسروں کے افکار کو پاکیزہ اور روشن کرنے، لوگوں کے دامن کو آلودگی اور گناہ سے دھونے اور انہیں پاک کرنے میں بہت کوشاں رہتے تھے۔

عیون الرضا میں امام علی بن موسیٰ علیہما السلام سے منقول ہے: آپؑ سے سوال کیا گیا: حواریوں کا یہ نام کیوں رکھا گیا؟

آپؑ نے فرمایا: ''بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کا مشغلہ کپڑے دھونا تھا، لیکن ہمارے نزدیک اس کی علت یہ ہے کہ انھوں نے خود کو بھی گناہ کی آلودگی سے پاک رکھا تھا اور دوسروں کو بھی پاک کرنے میں کوشاں رہتے تھے''۔

حواری قرآن اور انجیل کی نظر میں

قرآن نے حواریوں کے بارے میں گفتگو کی ہے اور ان کے ایمان کا تذکرہ کیا ہے۔ [2]

لیکن انجیل میں حواریوں کے بارے میں جو جملے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں لغزش کرتے تھے۔ انجیل متی اور لوقا کے باب 6 میں حواریوں کے نام اس طرح بیان کیے گئے ہیں۔

1۔ پطرس،	2۔ اندریاس،	3۔ یعقوب،
4۔ یوحنا،	5۔ فیلوپس،	6۔ برتولما،
7۔ توما،	8۔ متی،	9۔ یعقوب بن حلفا،
10۔ شمعون (جن کا لقب غیور تھا)	11۔ یہودا (جو یعقوب کے بھائی تھے)	

---

[1] سورہ آل عمران آیت 52

[2] سورہ صف آیت 14

12۔ یہودائے اسخر یوطی (جس نے حضرت مسیح علیہ السلام سے خیانت کی)

مشہور مفسر طبرسی مجمع البیان میں لکھتے ہیں: حواری حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ جب کبھی انہیں بھوک یا پیاس لگتی، حکم خدا سے آب وغذا ان کے لئے مہیا ہوجاتی۔ وہ اسے اپنے لئے عظیم افتخار اور بڑا اعزاز سمجھتے، وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھتے: کیا ہم سے بڑھ کر بھی کوئی افضل و بالاتر ہے، تو وہ کہتے: ہاں ''وہ شخص تم سے افضل ہے جو اپنے ہاتھ سے کماتا ہے اور اپنی کمائی کھاتا ہے''۔ اس کے بعد وہ لوگوں کے کپڑے دھوتے تھے اور اس کام سے اجرت لیتے تھے (یوں عملاً انہوں نے سب لوگوں کو درس دیا کہ کام اور کوشش کرنا کوئی ننگ وعار نہیں ہے)۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت قبول کر لینے کے بعد حواریوں نے ان کا ساتھ دیا، ان کی مدد کی اور انہیں اپنے ایمان پر گواہ بنایا۔ پھر بارگاہ الٰہی کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنا ایمان پیش کیا اور کہنے لگے: ''پروردگار جو کچھ تو نے بھیجا ہے ہم اس پر ایمان لائے ہیں''۔ [1]

لیکن ایمان کا چونکہ دعویٰ ہی کافی نہیں تھا، اس لئے ساتھ ہی آسمانی احکام پر عمل کرنے اور پیغمبر خدا (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی پیروی کا ذکر کرنے لگے اور کہنے لگے: ''ہم نے تیرے بھیجے ہوئے مسیح کی پیروی کی''۔ [2]

اور یہ ہمارے ایمان راسخ کا زندہ ثبوت ہے۔

اس کے بعد انہوں نے تقاضا کیا کہ خدا ان کے نام شہادت دینے والوں اور گواہوں کے زمرے میں شمار کرے۔ یہ گواہ وہی لوگ ہیں جو اس دنیا میں امتوں کی رہبری کرتے ہیں اور قیامت میں لوگوں کے نیک و بد اعمال کے گواہ ہوں گے۔

حواریوں پر مائدہ کے نزول کا واقعہ

قرآن ان نعمات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو حواریوں یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزدیکی اصحاب وانصار کو بخشی گئی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے: اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے حواریوں کی طرف وحی بھیجی کہ مجھ پر اور میرے بھیجے ہوئے مسیح پر ایمان لے آؤ تو انہوں نے میری دعوت کو قبول کر لیا اور کہا کہ ہم ایمان لے آئے، خدایا گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں اور تیرے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد مائدہ آسمانی کے نزول کے مشہور واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ''مسیح کے اصحاب خاص نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہا کیا تیرا پروردگار ہمارے لئے آسمان سے غذا بھیج سکتا ہے؟''۔ [3]

حضرت مسیح علیہ السلام نے اس مطالبہ پر کہ جس میں ایسے ایسے معجزات و آیات دکھانے کے باوجود شک اور تردید کی بو آرہی تھی، غور کیا اور انہیں تنبیہ کی اور کہا کہ: ''اگر تم ایمان رکھتے ہو تو خدا سے ڈرو''۔ [4]

لیکن انہوں نے جلد ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بتا دیا کہ ہمارا اس مطالبہ سے کوئی غلط مقصد نہیں ہے اور نہ ہی اس میں ہماری کسی ہٹ دھرمی کی غرض پوشیدہ ہے ''بلکہ ہماری تمنا یہ ہے کہ ہم اس مائدہ میں سے کھائیں (اور آسمانی غذا کے کھانے سے نورانیت ہمارے

---

[1] سورہ آل عمران 53

[2] سورہ آل عمران 53

[3] سورہ مائدہ آیت 112

[4] سورہ مائدہ آیت 112

دل میں پیدا ہوگی، کیونکہ غذا مسلمہ طور پر روح انسانی پر اثر انداز ہوتی ہے، اس کے علاوہ) ہمارے دلوں میں راحت پیدا ہوگی اور اطمینان حاصل ہوگا اور یہ عظیم معجزہ دیکھنے سے ہم ''علم الیقین'' کی سرحد تک پہنچ جائیں گے اور یہ جان لیں گے کہ آپ نے جو کچھ ہم سے کہا ہے وہ سچ ہے تا کہ ہم اس پر گواہی دے سکیں''۔ [1]

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے اس مطالبہ میں ان کی حسن نیت سے آگاہ ہوئے تو ان کی درخواست کو بارگاہ خداوندی میں اس طرح سے بیان فرمایا: ''کہ خداوندا ہمارے لئے آسمان سے مائدہ بھیج جو ہمارے اول و آخر کے لئے عید ہو اور تیری طرف سے ایک نشانی شمار ہو اور ہمیں رزق عطا فرما کہ تو ہی بہترین روزی رساں ہے''۔ [2]

اس میں یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی درخواست کو بہت ہی عمدہ طریقے سے بارگاہ خداوندی میں پیش کیا، جس میں حق طلبی کی روح کا اظہار بھی پایا جاتا ہے اور اجتماعی و عمومی مصالح کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔

خداوند متعال نے اس دعا کو کہ جو حسن نیت اور خلوص کے ساتھ دل سے نکلی تھی قبول کر لیا اور ان سے فرمایا کہ: ''میں اس قسم کا مائدہ تم پر نازل کروں گا لیکن اس بات پر بھی توجہ رہنی چاہئے کہ اس مائدہ کے اترنے کے بعد تمہاری ذمہ داری بہت سخت ہو جائے گی اور اس قسم کا واضح معجزہ دیکھنے کے بعد جس شخص نے راہ کفر اختیار کی تو اسے ایسی سزا دوں گا کہ عالمین میں سے کسی کو ایسی سزا نہیں دی ہوگی''۔ [3]

یہ آسمانی مائدہ کیا تھا

یہ آسمانی مائدہ جن چیزوں پر مشتمل تھا ان کے بارے میں قرآن میں کوئی تذکرہ نہیں ہے لیکن احادیث میں ہے کہ جن میں سے ایک حدیث امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ وہ کھانا چند روٹیاں اور چند مچھلیاں تھیں۔

شاید اس قسم کے معجزے کے مطالبے کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے سن رکھا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ سے بنی اسرائیل پر مائدہ آسمانی اترا تھا۔ لہٰذا انہوں نے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اسی قسم کا تقاضا کیا۔

عہد جدید اور مائدہ

موجودہ چاروں انجیلوں میں مائدہ کے بارے میں اس طرح کی گفتگو نہیں ہے جس طرح کہ ہم قرآن مجید میں دیکھتے ہیں۔ اگر چہ انجیل یوحنا باب 21 میں ایک بیان ایسا موجود ہے کہ جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے لوگوں کو کھانا کھلانے اور ان کی طرف سے روٹی مچھلی کے ساتھ معجزانہ طور پر دعوت کا ذکر کیا گیا ہے لیکن تھوڑی سی توجہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس مائدہ آسمانی اور حواریوں کے مسئلے سے کوئی ربط نہیں ہے۔

کتاب ''اعمال رسولان'' میں بھی جو ''عہد جدید'' کی ایک کتاب ہے، پطرس نامی ایک حواری پر نزول مائدہ کا ذکر کیا گیا ہے، وہ بھی اس بحث سے الگ چیز ہے کہ جس کے بارے میں ہم گفتگو کر رہے ہیں، لیکن کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ بہت سے ایسے حقائق ہیں کہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئے تھے مگر وہ موجودہ انجیلوں میں نہیں ہیں، ایسے ہی جیسا کہ بہت سے ایسے مطالب ہیں جو

---

[1] سورہ مائدہ آیت 113

[2] سورہ مائدہ آیت 114

[3] سورہ مائدہ آیت 115

انجیلوں میں لکھے ہوئے ہیں مگر وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل نہیں ہوئے تھے لہٰذا اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے نزول مائدہ کے واقعہ کے سلسلے میں کوئی مشکل پیدا نہیں ہوگی۔

انجیل یا اناجیل؟

''انجیل'' اصل میں یونانی لفظ ہے۔ اس کا معنی ہے ''بشارت'' یا ''جدید تعلیم'' یہ اس کتاب کا نام جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی، یہ امر قابل ذکر ہے کہ قرآن نے محل گفتگو میں اور دیگر آیات کہ جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب کا نام لیا ہے، یہ لفظ مفرد ہی استعمال ہوا ہے اور اسے خدا کی طرف سے نازل شدہ قرار دیا ہے، اب وہ بہت سی اناجیل جو عیسائیوں میں مروج ہیں، وحی الٰہی نہیں ہیں۔

ان اناجیل میں یہ چار زیادہ مشہور ہیں:

1۔ لوقا 2۔ مرقس 3۔ متی 4۔ یوحنا

ان کے وحی الٰہی نہ ہونے کا خود عیسائی بھی انکار نہیں کرتے۔ موجودہ انجیلیں سب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شاگردوں یا ان کے شاگردوں کی ہیں اور آپ سے کافی مدت بعد لکھی گئی ہیں۔ عیسائیوں کا دعویٰ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگردوں نے یہ اناجیل الہام الٰہی سے لکھی ہیں۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عہد جدید اور اناجیل کے بارے میں تحقیق کرتے ہوئے ان کے مصنفین سے واقفیت حاصل کریں۔

عیسائیوں کی اہم ترین مذہبی کتاب عہد جدید کا مجموعہ ہے جس پر تمام عیسائی فرقے ایک آسمانی کتاب کی حیثیت سے ایمان رکھتے ہیں۔

عہد جدید کا مجموعہ عہد قدیم کے تیسرے حصے سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ 27 متفرق کتب و رسائل پر مشتمل ہے۔ یہ بالکل مختلف موضوعات کی حامل ہیں۔ ان کی ترتیب یہ ہے:

1۔ انجیل متی: متی حضرت مسیح علیہ السلام کے بارہ شاگردوں میں سے ایک تھا۔ یہ انجیل اس نے 38 عیسوی میں یا بعض کے نظریہ کے مطابق سنہ میلادی 50 سے لیکر سنہ میلادی 60 کے درمیان لکھی۔

2۔ انجیل مرقس: کتاب قاموس مقدس کے صفحہ 792 پر ہے کہ مرقس حواریوں میں سے نہ تھا۔ اس نے اپنی انجیل پطرس کی زیر نگرانی تصنیف کی۔ مرقس سنہ میلادی 68 میں قتل ہوگیا۔

3۔ انجیل لوقا: ''لوقا پولس رسول کا رفیق اور ہمسفر تھا۔ پولس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے ایک عرصہ بعد عیسائیت قبول کی، یہ آپ کے زمانے میں متعصب یہودی تھا۔ لوقا کی وفات سنہ میلادی 70 کے قریب ہوئی ہے قاموس مقدس کے مؤلف نے اپنی تالیف کے صفحہ 772 پر لکھا ہے کہ انجیل لوقا کی تالیف عام خیال کے مطابق تقریباً سنہ میلادی 63 میں ہوئی۔

4۔ انجیل یوحنا: یوحنا مسیح علیہ السلام کے شاگردوں میں سے تھا اور پولس کا دوست اور ہمسفر تھا۔ مؤلف مذکور کے بقول اس کی تالیف زیادہ تر ناقدین کے نزدیک پہلی صدی کے آخری حصے میں لکھی گئی۔

یہ اناجیل عموماً حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی دیئے جانے اور اسکے بعد کے حوادث کے ذکر سے معمور ہیں۔ اس سے اچھی طرح ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب اناجیل حضرت مسیح علیہ السلام کے سالہا سال بعد لکھی گئی ہیں، اور ان میں کوئی بھی کتاب آسمانی نہیں ہے جو حضرت

مسیح علیہ السلام پر نازل ہوئی ہو۔

5۔اعمال رسولانہ: (صدر اول میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری اور مبلغین کے اعمال۔)

6۔14 رسالے: مختلف افراد اور اقوام کے نام پولس کے خطوط۔

7۔رسالہ یعقوب: (عہد جدید کے ستائیس کتب ورسائل میں سے یہ بیسواں رسالہ ہے۔)

8۔پطرس کے خطوط: یہ عہد جدید کے اکیسویں اور بائیسویں رسالے پر مشتمل ہیں۔

9۔یوحنا کے خطوط: (یہ تین رسالوں پر مشتمل ہیں 23، 24 اور 25 رسالوں میں یہی خطوط ہیں۔)

10۔نامہ یہودا: (یہ عہد جدید کا چھبیسواں رسالہ۔)

11۔مکاشفہ یوحنا: (یہ عہد جدید کا آخری حصہ ہے۔)

لہٰذا عیسائی مؤرخین کی تصریح، نیز اناجیل اور عہد جدید کی دیگر کتب ورسائل کے مطابق ان میں سے کوئی بھی آسمانی کتاب نہیں ہے۔مزید یہ کہ یہ تمام کتب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد لکھی گئی ہیں۔اس گفتگو سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام پر نازل ہونے والی آسمانی کتاب درمیان میں سے اٹھ گئی ہے اور آج دستیاب نہیں ہے۔اس کے کچھ حصے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگردوں نے اپنی اناجیل میں بیان کئے ہیں باعث تاسف ہیں کہ ان میں بھی خرافات شامل ہو چکی ہیں۔

حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کے قتل کا منصوبہ

ہم نے کہا ہے کہ یہودیوں نے بعض جرائم پیشہ عیسائیوں کی مدد سے حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کا مصمم ارادہ کرلیا تھا لیکن خدا متعال نے ان کی سازشوں کو نقش برآب کردیا اور اپنے پیغمبر کو ان کے چنگل سے رہائی بخشی۔قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے جو احسان حضرت مسیح علیہ السلام پر کیے ہیں ان کا ذکر ہوا ہے۔ارشاد ہوتا ہے: ''اے عیسیٰ میں تمہیں لے لوں گا اور اپنی طرف اٹھالوں گا)۔[1]

سورہ نساء کی آیت 157 سے استشناد کرتے ہوئے مفسرین میں یہ مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قتل نہیں ہوئے اور خدا انہیں آسمان کی طرف لے گیا۔لیکن خود عیسائی موجودہ اناجیل کے مطابق کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قتل ہوئے اور بعد ازاں انہیں دفن کردیا گیا، پھر وہ مردوں کے درمیان سے اٹھے، تھوڑی مدت زمین پر رہے اور آسمان کی طرف اٹھ گئے۔[2]

یہاں جس بات کی طرف توجہ ضروری ہے، یہ ہے کہ محل بحث آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت پر دلالت نہیں کرتی اگرچہ بعض یہ تصور کرتے ہیں کہ ''متوفیك'' کا مادہ ''وفات'' ہے اور یہ موت کے معنی میں ہے۔اس لئے ان کا خیال ہے کہ جو عقیدہ مسلمانوں میں مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے وفات نہیں پائی اور وہ زندہ ہیں اس مفہوم کے منافی ہے حالانکہ احادیث بھی اس عقیدے کی تائید کرتی ہیں نیز فوت ہاتھ سے نکل جانے کے معنی میں ہے اور توفی (بروزن ترقی) ''وفی'' کے مادہ سے ہے جس کا مطلب ہے ''کسی چیز کی تکمیل کرنا'' عہد و پیمان کرنے کو ''وفا'' بھی تکمیل کرنے اور اسے انجام پہنچانے کی وجہ سے کہتے ہیں۔اسی بناء پر اگر کوئی شخص کامل طور پر اپنا حق دوسرے سے اپنی تحویل میں لے لے تو عرب کہتے ہیں ''توفی دینہ'' یعنی اپنا حق پورا پورا وصول

---

[1] آل عمران آیت 55

[2] المنار کے مؤلف کی طرح بعض مفسرین اسلام کا عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام قتل ہوئے اور خدا صرف ان کی روح کو آسمان کی طرف لے گیا۔

کرلیا۔آیات قرآنی میں بھی ''توفی'' بارہا'' لینے'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔مثلاً:

وھو الذی یتوفکم باللیل و یعلم ماجرحتم بالنھار۔

وہ ذات وہ ہے جو تمہاری روح کو رات کے وقت لے لیتی ہے اور جو کچھ تم دن کو انجام دیتے ہو اس سے آگاہ ہے۔(انعام۔60)اس آیت میں نیند کو''توفی روح'' کہا گیا ہے۔یہی معنی سورہ زمر کی آیہ 42 میں بھی آیا ہے۔قرآن کی متعدد دیگر آیات میں بھی لفظ''توفی''''لینے'' کے معنی میں نظر آتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ''توفی''بعض اوقات''موت'' کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے لیکن وہاں بھی درحقیقت موت کے مفہوم میں نہیں بلکہ روح کو اپنی تحویل میں لے لینے کے معنی میں ہے۔اصولی طور پر''توفی'' کے معنی میں''موت''پوشیدہ نہیں ہے۔اور''فوت'' کا مادہ''وفی'' کے مادہ سے بالکل جدا ہے۔

مسیح علیہ السلام قتل نہیں ہوئے،افسانہ صلیب

قرآن کہتا ہے:''مسیح قتل نہیں ہوئے اور نہ سولی پر چڑھے بلکہ معاملہ ان پر مشتبہ ہوگیا اور انھوں نے خیال کیا کہ انہیں سولی پر لٹکا دیا ہے حالانکہ یقیناً انھوں نے انہیں قتل نہیں کیا''۔[1]

موجودہ چاروں اناجیل(متی،لوقا،مرقس اور یوحنا)میں حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی پر لٹکائے جانے اور ان کے قتل کا ذکر ہے۔یہ بات چاروں انجیلوں کے آخری حصوں میں تشریح وتفصیل سے بیان کی گئی ہے۔آج کے عام مسیحیوں کا بھی یہی عقیدہ ہے۔بلکہ ایک لحاظ سے توقتل مسیح علیہ السلام اور انہیں مصلوب کیا جانا موجودہ مسیحیت کے اہم ترین بنیادی مسائل میں سے ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ موجودہ عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام کو ایسا پیغمبر نہیں مانتے جو مخلوق کی ہدایت،تربیت اور ارشاد کے لئے آیا ہو بلکہ وہ انہیں خدا کا بیٹا اور تین خداؤں میں سے ایک کہتے ہیں جس کا اس دنیا میں آنے کا اصلی ہدف ہی خدا ہونا ہے اور اپنی قربانی کے عوض نوع بشر کے گناہوں کا سودا کرتا ہے۔

عیسائی کہتے ہیں کہ وہ اس لئے آئے تاکہ ہمارے گناہوں کا فدیہ بن جائیں وہ سولی چڑھے اور قتل ہوئے تاکہ نوع بشر کے گناہوں کو دھوڈالیں اور عالمین کو سزا سے نجات دلائیں۔اس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ راہ نجات مسیح علیہ السلام سے رشتہ جوڑنے اور ان کے مصلوب ہونے کا عقیدہ رکھنے میں منحصر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ مسیحیت کو''مذہب نجات''یا''مذہب خدا'' کہتے ہیں اور مسیح علیہ السلام کو''ناجی''یا''فادی'' کہتے ہیں یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائی صلیب کا نشان بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں،اور صلیب ان کا شعار ہے اسی کی وجہ ان کا یہی عقیدہ ہے۔

یہ تھا حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں عیسائیوں کے عقیدے کا خلاصہ،لیکن کوئی مسلمان بھی اس میں شک نہیں رکھتا کہ یہ عقیدہ باطل ہے اس کی وجوہات یہ ہیں۔

1۔حضرت مسیح علیہ السلام دیگر انبیاء کی طرح ایک پیغمبر تھے نہ وہ خدا تھے نہ خدا کے بیٹے۔خدا یکتا و یگانہ ہے اس کا کوئی شبیہ ونظیر مثل و مانند اور بیوی بیٹا نہیں ہے۔

2۔گناہوں کا فدیہ بننا بالکل غیر منطقی بات ہے،ہر شخص اپنے اعمال کا جوابدہ اور ذمہ دار ہے اور راہ نجات خود انسان کا اپنا

---

[1] سورہ نساء آیت 157

ایمان اور عمل صالح ہے۔

3۔ گناہ گاروں کے فدیہ کا عقیدہ فساد، تباہی اور آلودگی کی ترغیب وتشویق کرتا ہے یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن خصوصیت سے مسیح علیہ السلام کے مصلوب نہ ہونے کا ذکر کرتا ہے حالانکہ ظاہراً ایک معمولی سی بات نظر آتی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ فدیے اور امت کے گناہ خریدنے کے بے ہودہ اور فضول عقیدے کی سختی سے سرکوبی کی جائے اور عیسائیوں کو اس خرافاتی عقیدے سے نکالا جائے تاکہ وہ نجات کے لئے اپنے اعمال کو درست کریں نہ کہ عقیدہ صلیب کا سہارا لیں۔

4۔ بہت سے قرائن ایسے موجود ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب دیئے جانے کے عقیدے کی کمزوری پر دلالت کرتے ہیں، مثلاً:

الف: ہم جانتے ہیں کہ موجودہ چاروں انجیلیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہونے کا ذکر کرتی ہیں سب کی سب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے شاگردوں یا شاگردوں کے شاگردوں کے ذریعے لکھی گئی ہیں اور اس بات کا مسیحی مؤرخ بھی اعتراف کرتے ہیں۔

نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جناب مسیح علیہ السلام کے شاگرد دشمنوں کے حملے کے وقت بھاگ گئے تھے اور اناجیل بھی اس بات کی گواہ ہیں۔ لہٰذا انھوں نے مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے کے بارے میں عوام میں گردش کرتی ہوئی افواہ یا شہرت سنی اور وہیں سے یہ بات حاصل کی اور جیسا کہ بعد میں بیان کیا جائے گا کہ حالات ایسے پیش آئے کہ مسیح علیہ السلام کی جگہ دوسرا شخص اشتباہ میں پکڑ لیا گیا۔

ب: دوسرا عامل جو یہ امکان ظاہر کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بجائے اشتباہ میں دوسرا شخص پکڑا گیا ہو یہ ہے کہ شہر کے باہر ''جستیمانی'' باغ میں جو لوگ جناب عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کرنے کے لئے گئے وہ رومی لشکر کا ایک دستہ تھا یہ لوگ چھاؤنی میں اپنی فوجی ذمہ داریوں میں مشغول تھے یہ لوگ نہ یہودیوں کو پہچانتے تھے نہ وہاں کی زبان اور نہ آداب ورسوم جانتے تھے اور نہ ہی یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے شاگردوں میں سے پہچان سکتے تھے۔

ج: اناجیل کے مطابق حملہ رات کے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رہائش گاہ پر ہوا اس صورت میں تو اور بھی آسان ہے کہ تاریکی میں اصل انسان نکل جائے اور کوئی دوسرا اس کی بجائے گرفتار ہو جائے۔

د: تمام انجیلوں کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ گرفتار شدہ شخص نے رومی حاکم ''پیلاطس'' کے سامنے خاموشی اختیار کی اور اس کی گفتگو کے جواب میں اپنے دفاع کے لئے بہت کم ہی کچھ کہا۔ یہ بات بہت بعید ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے آپ کو خطرے میں دیکھیں اور اپنے بیان رسا، قوت گویائی اور شجاعت اور شہامت کے باوجود اپنا دفاع نہ کریں۔

تو کیا اس سے یہ احتمال پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی شخص ان کی جگہ پکڑا گیا ہو اور وحشت واضطراب کا ایسا شکار ہوا ہو کہ اپنے دفاع میں کچھ بھی نہ کہہ سکا ہو، قوی احتمال یہ ہے کہ وہ ''اسخر یوطی نامی یہودی'' تھا جس نے حضرت مسیح علیہ السلام سے خیانت کی اور ان کے خلاف جاسوسی کا کردار ادا کیا، کہتے ہیں کہ وہ جناب عیسیٰ علیہ السلام سے بہت مشابہت رکھتا تھا خصوصاً جبکہ موجودہ اناجیل میں ہے کہ اسخر یوطی یہودی اس واقعے کے بعد دیکھا نہیں گیا اور اناجیل ہی کے مطابق اس نے خودکشی کر لی تھی۔

ر: جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگرد اناجیل کی شہادت کے مطابق خطرہ محسوس کرتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ ظاہر ہے کہ دوسرے دوست احباب بھی اس دن چھپ گئے ہوں گے اور دور سے حالات پر نظر رکھے ہوں گے۔ لہٰذا گرفتار شدہ شخص رومی فوجیوں کے محاصرے میں تھا اور اس کے دوستوں میں سے کوئی اس کے گرد موجود نہیں تھا۔ اس میں کون سے تعجب

کی بات ہے کہ اشتباہ ہو گیا ہو۔

س: اناجیل میں ہے کہ جس شخص کو تختہ دار پر لٹکانے کا حکم دیا گیا اس نے تختہ دار پر خدا سے شکایت کی۔

تو نے مجھے کیوں تنہا چھوڑ دیا اور کیوں مجھے قتل ہونے کے لئے دشمن کے ہاتھ میں دے دیا۔

لہٰذا اگر حضرت مسیح علیہ السلام دنیا میں اس لئے آئے تھے کہ وہ سولی پر لٹکائے جائیں اور نوع انسان کے گناہوں کا فدیہ ہو جائیں تو پھر ایسی ناروا باتیں نہیں کرنا چاہئے تھیں۔ یہ جملہ واضح طور پر نشاندہی کرتا ہے کہ وہ شخص نہایت کمزور، ڈرپوک اور عاجز و ناتواں تھا اسی لئے ایسی باتیں کر رہا تھا اور نہ مسیح علیہ السلام ہوتے تو ایسی باتیں ہرگز نہ کرتے۔

ش: مسیحوں کے نزدیک قابل قبول چار انجیلوں کے علاوہ موجودہ بعض اناجیل مثلاً انجیل ''برنابا'' میں واضح طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہونے کی نفی کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ بعض محققین کا یہ نظریہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نام کے دو شخص تھے ایک عیسیٰ کو سولی دی گئی تھی اور دوسرے کو نہیں دی گئی تھی اور دونوں میں پانچ سو سال کا فاصلہ تھا۔

جو کچھ بیان کیا گیا ہے، یہ قرائن مجموعی طور پر حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل اور صلیب دیئے جانے کے بارے میں قرآن کے ''دعوی اشتباہ'' کو واضح کرتے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشارت، جناب عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی

قرآن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت اور اس کے مقابلے میں بنی اسرائیل کی کارشکنی اور تکذیب کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: ''اس وقت کو یاد کرو جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا: اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں، جبکہ میں اس کتاب کی جو مجھ سے پہلے بھیجی گئی (یعنی تورات) کی تصدیق کرنے والا ہوں''۔

''اور میں اس رسول کی بشارت دینے والا بھی ہوں جو میرے بعد آئے گا۔ اس کا نام احمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے''۔ [1]

عہدین کی بشارتیں اور ''فارقلیطا'' کی تعبیر

اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانہ میں یہود و نصاری کے پاس جو کچھ توریت و انجیل کے نام سے موجود ہے، وہ خدا کے عظیم پیغمبروں یعنی موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام پر نازل شدہ کتابیں نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ان کتابوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو ان کے اصحاب یا ان کے بعد آنے والوں کے ذریعے تالیف ہوا ہے۔ ان کتابوں کا ایک اجمالی مطالعہ اس بات کا زندہ گواہ ہے اور خود عیسائیوں اور یہودیوں کا بھی اس کے سوا اور کوئی دعویٰ نہیں ہے۔

لیکن اس کے باوجود اس میں بھی شک نہیں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام و عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات اور کتب آسمانی کے مضامین و مطالب کا کچھ حصہ ان کے پیروکاروں کے کلام کے ضمن میں منتقل ہو گیا ہے۔ اسی بناء پر جو کچھ عہد قدیم (توریت اور اس سے وابستہ کتابوں) اور عہد جدید (انجیل اور اس سے وابستہ کتابوں) میں آیا ہے، نہ تو اس سارے کے سارے کو قبول ہی کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی وہ سب کا سب قابل انکار ہے۔ بلکہ یہ دونوں کتابیں ان دو عظیم پیغمبروں کی تعلیمات اور دوسرے لوگوں کے افکار و تصورات سے وجود میں آئی ہیں۔

بہر حال موجودہ کتب میں بہت سی ایسی تعبیریں نظر آتی ہیں جو ایک عظیم ظہور کی بشارت دیتی ہیں کہ جس کی نشانیاں سوائے اسلام اور اسکے لانے والے کے اور کسی پر منطبق نہیں ہوتیں۔

---

[1] سورہ صف آیت 6

قابل توجہ بات یہ ہے کہ وہ پیشگوئیاں جو ان کتابوں میں نظر آتی ہیں اور پیغمبر اسلام کی ذات پر صادق آتی ہیں، ان کے علاوہ انجیل ''یوحنا'' کے تین موارد میں لفظ ''فارقلیطا'' آیا ہے۔ اس کا فارسی نسخوں میں ''تسلی دینے والا'' کے ساتھ ترجمہ ہوا ہے۔ اب آپ انجیل یوحنا کی طرف رجوع کریں: ''میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا ''تسلی دینے والا'' دے گا جو ابد تک تمہارے ساتھ رہے گا۔''

بعد والے باب میں آیا ہے: ''اور جب وہ تسلی دینے والا آئے گا جسے میں باپ کی طرف سے تمہاری طرف بھیجوں گا، یعنی سچائی کی روح جو باپ کی طرف سے آئے گی، وہ میرے بارے میں شہادت دے گی''۔

پھر اس کے بعد والے باب میں آیا ہے: ''لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے مفید ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ ''تسلی دینے والا'' تمہارے پاس نہیں آئے گا، لیکن اگر میں چلا جاؤں تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا''۔

اہم بات یہ ہے کہ سریانی اناجیل کے متن میں جو اصل یونانی سے لی گئی ہیں ''تسلی دینے والے'' کے بجائے ''پارقلیطا'' آیا ہے۔ اور یونانی متن میں ''پیرکلتوس'' آیا ہے کہ جو یونانی لغت کے لحاظ سے ''لائق تعریف شخص'' کے معنی میں ہے جو ''محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' و ''احمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' کا معادل ہے۔

لیکن جب ارباب کلیسا (عیسائی پادریوں) نے یہ دیکھا کہ اس قسم کے ترجمہ کی نشر واشاعت ان کے گھڑے ہوئے نظریات پر ضرب شدید لگائے گی تو ''پیرکلتوس'' کی بجائے ''پاراکلتوس'' لکھ دیا کہ جو ''تسلی دینے والے'' کے معنی میں ہے اس واضح تحریف کے ذریعے انھوں نے اس زندہ سند کو بدل کر رکھ دیا اگرچہ اس تحریف کے باوجود بھی مستقبل کے عظیم ظہور کی ایک واضح بشارت موجود ہے۔

یہاں ہم آپ کو اس لفظ کے اس ترجمہ کی طرف متوجہ کرتے ہیں جو اس سلسلہ میں دائرۃ المعارف کے بزرگ نے فرانسہ میں کیا ہے:

''محمد موسس دین اسلام، خدا کا بھیجا ہوا اور خاتم انبیاء ہے لفظ ''محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' بہت زیادہ تعریف کئے گئے کے معنی میں ہے اور مادہ حمد سے مشتق ہوا ہے جو تجلیل وتمجید کے معنی میں ہے عجب اتفاق کے زیر اثر ایک اور نام ذکر ہوا کہ اس کا مادہ بھی حمد ہی ہے اور لفظ محمد کا مترادف اور ہم معنی میں ہے عجیب اتفاق فوق یہ ہے کہ عرب کے عیسائی اس لفظ کو ''فارقلیط'' کے بجائے استعمال کرتے تھے احمد یعنی زیادہ تعریف کیا ہوا اور لفظ ''پیرکلتوس'' کا بہت عمدہ ترجمہ ہے کہ جس کی بجائے غلطی سے لفظ ''پاراکلتوس'' رکھ دیا گیا ہے، مسلمان مذہبی مولفین نے یہ بارہا گوش زد کیا ہے کہ اس لفظ سے مراد پیغمبر اسلام کے ظہور کی بشارت ہے اور قرآن مجید بھی سورہ صف کی حیرت انگیز آیت میں اس موضوع کی طرف واضح طور پر اشارہ کرتا ہے''۔[1]

خلاصہ یہ ہے کہ ''فارقلیطا'' کا معنی روح القدس یا تسلی دینے والا نہیں ہے، بلکہ یہ ''احمد'' کے معادل مفہوم رکھتا ہے۔

ایک اور زندہ گواہ

''فخر الاسلام'' جو کتاب ''انیس الاعلام'' کے مؤلف ہیں علماء نصاری میں سے تھے، انھوں نے اپنی تعلیم عیسائی پادریوں اور علماء ہی میں مکمل کی تھی اور ان کے یہاں ایک بلند مقام پیدا کیا تھا وہ اس کتاب کے مقدمے میں اپنے مسلمان ہونے کے عجیب وغریب

---

[1] دائرۃ المعارف بزرگ فرانسہ جلد 23 ص 4176

واقعے کو اس طرح بیان کرتے ہیں: بڑی جستجو، زحمتوں اور کئی ایک شہروں میں گردش کے بعد میں ایک عظیم پادری کے پاس پہنچا جو زہد و تقویٰ میں ممتاز تھا، ''کیتھولک فرقے کے بادشاہ وغیرہ اپنے مسائل کے لئے اسی سے رجوع کرتے تھے، ایک مدت تک میں اس کے پاس نصاریٰ کے مختلف مذاہب کی تعلیم حاصل کرتا رہا، اس کے بہت سے شاگرد تھے لیکن اتفاقاً مجھ سے اسے خاص ہی لگاؤ تھا، اس کے گھر کی سب چابیاں میرے ہاتھ میں تھیں، صرف ایک صندوق خانے کی چابی اس کے اپنے پاس ہوا کرتی تھی، اس دوران میں ایک دن اس پادری کو کوئی بیماری پیش آئی تو مجھ سے کہا کہ شاگردوں سے جا کر کہہ دو کہ آج میں درس نہیں دے سکتا، جب میں طالب علموں کے پاس آیا تو دیکھا کہ وہ بحث ومباحثے میں مصروف ہیں یہ بحث سریانی کے لفظ ''فارقلیطا'' اور یونانی زبان کے لفظ ''پریکلتوس'' کے معنی تک جا پہنچی اور وہ کافی دیر تک جھگڑتے رہے، ہر کسی کی الگ رائے تھی، واپس آنے پر استاد نے مجھ سے پوچھا آج کیا مباحثہ کرتے رہے ہو تو میں نے لفظ فارقلیطا کا اختلاف اس کے سامنے بیان کیا وہ کہنے لگا: تو نے ان میں کس قول کا انتخاب کیا ہے، میں نے کہا فلاں مفسر کے قول کا میں نے پسند کیا ہے۔

استاد پادری کہنے لگا تو نے کوتاہی تو نہیں کی لیکن حق اور واقعہ اس تمام اقوال کے خلاف ہے کیونکہ اس کی حقیقت کو ''راسخون فی العلم'' کے علاوہ دوسرے لوگ نہیں جانتے اور ان میں سے بھی بہت کم اس حقیقت سے آشنا ہیں، میں نے اصرار کیا کہ اس کے معنی مجھے بتائیے ے، وہ بہت رویا اور کہنے لگا: میں کوئی چیز تم سے نہیں چھپاتا لیکن اس نام کے معنی معلوم ہو جانے کا نتیجہ تو بہت سخت ہوگا کیونکہ اس کے معلوم ہونے کے ساتھ ہی مجھے اور تمہیں قتل کر دیا جائے گا، اب اگر تم وعدہ کرو کہ کسی سے نہیں کہو گے تو میں اسے ظاہر کر دیتا ہوں۔

میں نے تمام مقدسات مذہبی کی قسم کھائی کہ اسے فاش نہیں کروں گا تو اس نے کہا کہ یہ مسلمانوں کے پیغمبر کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور اس کے معنی ''احمد'' اور ''محمد'' ہیں، اس کے بعد اس نے اس چھوٹے کمرے کی چابی مجھے دی اور کہا کہ فلاں صندوق کا دروازہ کھولو اور فلاں فلاں کتاب لے لو، میں کتابیں اس کے پاس لے آیا، یہ دونوں کتابیں رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور سے پہلے کی تھیں اور چمڑے پر لکھی ہوئی تھیں دونوں کتب میں لفظ ''فارقلیطا'' کا ترجمہ ''احمد'' اور ''محمد'' کیا گیا تھا اس کے بعد استاد نے مزید کہا کہ آنحضرت کے ظہور سے پہلے علماء نصاریٰ میں کوئی اختلاف نہ تھا کہ فارقلیطا کے معنی احمد و محمد ہیں، لیکن ظہور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اپنی سرداری اور مادی فوائد کی بقا کے لئے اس کی تاویل کر دی اور اس کے لئے دوسرے معنی گھڑ لئے حالانکہ وہ معنی یقیناً صاحب انجیل کی مراد نہیں۔

میں نے سوال کیا کہ دین نصاریٰ کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں، اس نے کہا دین اسلام کے آنے سے منسوخ ہو گیا ہے اس جملے کی اس نے تین مرتبہ تکرار کی۔

پس میں نے کہا کہ اس زمانے میں طریق نجات اور صراط مستقیم، کون سا ہے۔

اس نے کہا: مختصر ہے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی واتباع میں۔

میں نے کہا کیا اس کی پیروی کرنے والے اہل نجات ہیں، اس نے کہا ہاں خدا کی قسم (اور تین مرتبہ قسم کھائی)

پھر استاد نے گریہ کیا اور میں بھی بہت رویا اور اس نے کہا اگر آخرت اور نجات چاہتے ہو تو ضرور دین حق قبول کر لو، میں ہمیشہ تمہارے لئے دعا کروں گا اس شرط کے ساتھ کہ قیامت کے دن گواہی دو کہ میں باطن میں مسلمان اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیروکار رہوں اور علماء نصاریٰ کے ایک گروہ کی باطن میں مجھ جیسی حالت ہے اور میری طرح ظاہراً اپنے دنیاوی مقام سے دست کش نہیں ہو سکتے ورنہ

کوئی شک وشبہ نہیں کہ اس وقت روئے زمین پر دین خدا دین اسلام ہی ہے۔''

آپ دیکھیں کہ علماء اہل کتاب نے پیامبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کے بعد اپنے شخصی منافع کی خاطر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام اور نشانیوں کی اور توجیہات کر دی ہیں۔

حضرت لقمان

حضرت لقمان کا نام سورہ لقمان کی دو آیات میں آیا ہے، آیا وہ پیغمبر تھے یا صرف ایک دانا اور صاحب حکمت انسان تھے؟ قرآن میں اس کی کوئی وضاحت نہیں ملتی، لیکن ان کے بارے میں قرآن کا لب ولہجہ نشان دہی کرتا ہے کہ وہ پیغمبر نہیں تھے کیونکہ عام طور پر پیغمبروں کے بارے میں جو گفتگو ہوتی ہے اس میں رسالت؛ توحید کی طرف دعوت، شرک اور ماحول میں موجود بے راہ روی سے نبرد آزمائی، رسالت کی ادائیگی کے سلسلہ میں کسی قسم کی اجرت کا طلب نہ کرنا نیز امتوں کو بشارت وانذار کے مسائل وغیرہ دیکھنے میں آتے ہیں، جب کہ لقمان کے بارے میں ان مسائل میں سے کوئی بھی بیان نہیں ہوا، صرف انکے پند نصائح بیان ہوئے ہیں جو اگر چہ خصوصی طور پر تو ان کے اپنے بیٹے کے لئے ہیں لیکن ان کا مفہوم عمومی حیثیت کا حامل ہے اور یہی چیز اس بات پر گواہ ہے کہ وہ صرف ایک مرد حکیم ودانا تھے۔

جو حدیث پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہے اس طرح درج ہے:

''سچی بات یہ ہے کہ لقمان پیغمبر نہیں تھے بلکہ وہ اللہ کے ایسے بندے تھے جو زیادہ غور وفکر کیا کرتے، ان کا ایمان ویقین اعلی درجے پر تھا، خدا کو دوست رکھتے تھے اور خدا بھی انہیں دوست رکھتا تھا اور اللہ نے انہیں اپنی نعمتوں سے مالا مال کر دیا تھا''۔

بعض تواریخ میں ہے لقمان مصر اور سوڈان کے لوگوں میں سے سیاہ رنگ کے غلام تھے باوجود یکہ ان کا چہرہ خوبصورت نہیں تھا لیکن روشن دل اور مصفا روح کے مالک تھے وہ ابتدائے زندگی سے سچ بولتے اور امانت کو خیانت سے آلودہ نہ کرتے اور جو امور ان سے تعلق نہیں رکھتے تھے ان میں دخل اندازی نہیں کرتے تھے۔

بعض مفسرین نے ان کی نبوت کا احتمال دیا ہے لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ واضح شواہد اس کے خلاف موجود ہیں۔

یہ تمام حکمت کہاں سے

بعض روایات میں آیا ہے کہ ایک شخص نے لقمان سے کہا کیا ایسا نہیں ہے کہ آپ ہمارے ساتھ مل کر جانور چرایا کرتے تھے؟

آپ نے جواب میں کہا ایسا ہی ہے اس نے کہا تو پھر آپ کو یہ سب علم وحکمت کہاں سے نصیب ہوئے؟

لقمان نے فرمایا: اللہ کی قدرت، امانت کی ادائیگی، بات کی سچائی اور جو چیز مجھ سے تعلق نہیں رکھتی اس کے بارے میں خاموشی اختیار کرنے سے

حدیث بالا کے ذیل میں انحضرت سے ایک روایت یوں بھی نقل ہوئی ہے کہ:

''ایک دن حضرت لقمان دوپہر کے وقت ارام فرما رہے تھے کہ اچانک انھوں نے ایک آواز سنی کہ اے لقمان کیا آپ چاہتے ہیں کہ خداوند عالم آپ کو زمین میں خلیفہ قرار دے تا کہ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کریں؟

لقمان نے اس کے جواب میں کہا کہ اگر میرا پروردگار مجھے اختیار دے دے تو میں عافیت کی راہ قبول کروں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر اس قسم کی ذمہ داری میرے کندھے پر ڈال دے گا تو یقیناً میری مدد بھی کرے گا اور مجھے لغزشوں سے بھی محفوظ رکھے گا۔

فرشتوں نے اس حالت میں کہ لقمان انہیں دیکھ رہے تھے کہا اے لقمان کیوں (ایسا نہیں کرتے؟)

تو انھوں نے کہا اس لئے کیونکہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنا سخت ترین منزل اور اہم ترین مرحلہ ہے اور ہر طرف سے ظلم وستم کی موجیں اس کی طرف متوجہ ہیں اگر خدا انسان کی حفاظت کرے تو وہ نجات پا جائے گا لیکن اگر خطا کی راہ پر چلے تو یقیناً جنت کی راہ سے منحرف ہو جائے گا اور جس شخص کا سر دنیا میں جھکا ہوا اور اخرت میں بلند ہو اس سے بہتر ہے کہ جس کا سر دنیا میں بلند اور اخرت میں جھکا ہوا ہو اور جو شخص دنیا کو اخرت پر ترجیح دے تو نہ تو وہ دنیا کو پا سکے گا اور نہ ہی اخرت کو حاصل کر سکے گا۔

فرشتے لقمان کی اس دلچسپ گفتگو اور منطقی باتوں سے متعجب ہوئے، لقمان نے یہ بات کہی اور سو گئے اور خدا نے نور حکمت ان کے دل میں ڈال دیا جس وقت بیدار ہوئے تو ان کی زبان پر حکمت کی باتیں تھیں"۔

اصحاب کہف

چند بیدار فکر اور باایمان نوجوان تھے، وہ ناز ونعمت کی زندگی بسر کر رہے تھے، انھوں نے اپنے عقیدے کی حفاظت اور اپنے زمانے کے طاغوت سے مقابلے کے لئے ان سب نعمتوں کو ٹھوکر ماردی پہاڑ کے ایک غار میں جا پناہ لی، وہ جس میں کچھ بھی نہ تھا، یہ اقدام کر کے انھوں نے راہ ایمان میں اپنی استقامت اور پامردی ثابت کر دی۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ اس مقام پر قرآن فن فصاحت و بلاغت کے ایک اصول سے کام لیتے ہوئے پہلے ان افراد کی سر گزشت کو اجمالی طور پر بیان کرتا ہے تا کہ سننے والوں کا ذہن مائل ہو جائے، اس سلسلے میں چار آیات میں واقعہ بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد میں تفصیل بیان کی گئی ہے۔

اصحاب کہف کی زندگی کا اجمالی جائزہ

پہلے فرمایا گیا ہے: "کیا تم سمجھتے ہو کہ اصحاب کہف ورقیم ہماری عجیب آیات میں سے تھے"۔[1]

زمین وآسمان میں ہماری بہت سی عجیب آیات ہیں کہ جن میں سے ہر ایک عظمت تخلیق کا ایک نمونہ ہے، خود تمہاری زندگی میں عجیب اسرار موجود ہیں کہ جن میں سے ہر ایک تمہاری دعوت کی حقانیت کی نشانی ہے اور اصحاب کہف کی داستان مسلماً ان سے عجیب تر نہیں ہے۔

"اصحاب کہف" (اصحاب) کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ انھوں نے اپنے جان بچانے کے لئے میں پناہ لی تھی جس کی تفصیل ان کی زندگی کے حالات بیان کرتے ہوئے آئے گی۔

لیکن "رقیم" دراصل "رقم" کے مادہ سے "لکھنے" کے معنی میں ہے، زیادہ تر مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہ اصحاب کہف کا دوسرا نام ہے کیونکہ آخر کار اس کا نام ایک تختی پر لکھا گیا اور اسے کے دروزاے پر نصب کیا گیا۔

---

[1] سورۂ کہف آیت 9

بعض اسے اس پہاڑ کا نام سمجھتے ہیں کہ جس میں یہ تھی اور بعض اس زمین کا نام سمجھتے ہیں کہ جس میں وہ پہاڑ تھا بعض کا خیال ہے کہ یہ اس شہر کا نام ہے جس سے اصحاب کہف نکلے تھے لیکن پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔[1]

اس کے بعد فرمایا گیا ہے:

''اس وقت کا سوچو جب چند جوانوں نے ایک غار میں جا پناہ لی''۔[2]

جب وہ ہر طرف سے مایوس تھے، انہوں نے بارگاہ خدا کا رخ کیا اور عرض کی: ''پروردگارا ہمیں اپنی رحمت سے بہرہ ور کر''۔[3]

اور ہمارے لئے راہ نجات پیدا کر دے۔

ایسی راہ کہ جس سے ہمیں اس تاریک مقام سے چھٹکارا مل جائے اور تیری رضا کے قریب کر دے۔ ایسی راہ کہ جس میں خیر و سعادت ہو اور ذمہ داری ادا ہو جائے۔

ہم نے ان کی دعا قبول کی ''ان کے کانوں پر خواب کے پردے ڈال دیئے اور وہ سالہا سال تک غار میں سوئے رہے''۔

''پھر ہم نے انہیں اٹھایا اور بیدار کیا تا کہ ہم دیکھیں کہ ان میں سے کون لوگ اپنی نیند کی مدت کا بہتر حساب لگاتے ہیں''۔[4]

داستان اصحاب کہف کی تفصیل

جیسا کہ ہم نے کہا ہے اجمالی طور پر واقعہ بیان کرنے کے بعد میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ گفتگو کا آغاز یوں کیا گیا ہے: ''ان کی داستان، جیسا کہ ہے، ہم تجھ سے بیان کرتے ہیں''۔[5]

ہم اس طرح سے واقعہ بیان کرتے ہیں کہ وہ ہر قسم کی فضول بات بے بنیاد چیزوں اور غلط باتوں سے پاک ہوگا۔

---

[1] سورہ کہف آیت 9

[2] رہا بعض کا یہ احتمال کہ اصحاب کہف اور تھے اور اصحاب رقیم اور تھے بعض روایت میں ان کے بارے میں ایک داستان بھی نقل کی گئی ہے، یہ ظاہر آیت سے ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ زیر قرآن کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ اصحاب کہف و رقیم ایک ہی گروہ کا نام ہے یہی وجہ ہے کہ ان دو الفاظ کے استعمال کے بعد صرف ''اصحاب کہف'' کہہ کر داستان شروع کی گئی ہے اور انکے علاوہ ہرگز کسی دوسرے گروہ کا ذکر نہیں کیا گیا، یہ صورت حال خود ایک ہی گروہ ہونے کی دلیل ہے۔

[3] سورہ کہف آیت 10

جیسا کہ قرآن میں موجود ہے: "اذا وی الفتیة الی الکهف"

(فتیة) فتی کی جمع ہے۔ دراصل یہ نوخیز و سرشار جوان کے معنی میں ہے البتہ کبھی کبھار بڑی عمر والے ان افراد کے لئے بھی بولا جاتا ہے کہ جن کے جذبے جوان اور سرشار ہوں۔ اس لفظ میں عام طور پر جواں مردی حق کے لئے ڈٹ جانے اور حق کے حضور سر تسلیم خم کرنے کا مفہوم بھی ہوتا ہے۔

اس امر کی شاہد وہ حدیث ہے جو امام صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے۔

امام علیہ السلام نے اپنے ایک صحابی سے پوچھا: ''فتی'' کس شخص کو کہتے ہیں؟ اس نے جواباً عرض کیا: ''فتی'' نوجوان کو کہتے ہیں۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: کیا تجھے نہیں پتہ کہ اصحاب کہف پکی عمر کے آدمی تھے لیکن اللہ نے انہیں ''فتیۃ'' کہا ہے اس لئے کہ وہ اللہ پر ایمان رکھتے تھے۔

اس کے بعد مزید فرمایا: جو اللہ پر ایمان رکھتا ہو اور تقوی اختیار کیے ہو وہ ''فتی'' (جواں مرد) ہے۔

[4] سورہ کہف آیت 10

[5] سورہ کہف آیت 11 تا 12

''وہ چند جواں مرد تھے کہ جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کی ہدایت اور بڑھا دی تھی''۔[1]

قرآن سے اجمالی طور پر اور تاریخ سے تفصیلی طور پر یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ اصحاب کہف جس دور اور ماحول میں رہتے تھے اس میں کفر و بت پرستی کا دور دورہ تھا۔ ایک ظالم حکومت کہ جو عام طور پر شرک، کفر، جہالت، غارت گری اور ظلم کی محافظ تھی لوگوں کے سروں پر مسلط تھی۔

لیکن یہ جواں مرد کہ جو ہوش و صداقت کے حامل تھے آخر کار اس دین کی خرابی کو جان گئے۔ انہوں نے اس کی خلاف قیام کا مصمم ارادہ کر لیا اور فیصلہ کیا کہ اگر اس دین کے خاتمے کی طاقت نہ ہوئی تو ہجرت کر جائیں گے۔ اسی لئے گزشتہ بحث کے بعد قرآن کہتا ہے: ''جب انہوں نے قیام کیا اور کہا کہ ہمارا رب آسمان و زمین کا پروردگار ہے، ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس کے علاوہ کسی معبود کی ہرگز پرستش نہیں کریں گے''۔[2]

''اگر ہم ایسی بات کریں اور اس کے علاوہ کسی کو معبود سمجھیں تو ہم نے بے ہودہ اور حق سے دور بات کہی''۔[3]

ان با ایمان جواں مردوں نے واقعاً توحید کے اثبات اور ''الٰھہ'' کی نفی کے لئے واضح دلیل کا سہارا لیا اور وہ یہ کہ ہم واضح طور پر دیکھ رہے ہیں کہ آسمان و زمین کا کوئی مالک اور پروردگار بھی وہی آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے۔

اس کے بعد وہ ایک اور دلیل سے متوسل ہوئے اور وہ یہ کہ ''ہماری قوم نے خدا کے علاوہ معبود بنا رکھے ہیں''[4]

تو کیا دلیل و برہان کے بغیر بھی اعتقاد رکھا جا سکتا ہے ''وہ ان کی الوہیت کے بارے میں کوئی واضح دلیل پیش کیوں نہیں کرتے''۔[5]

کیا تصور، خیال یا اندھی تقلید کی بناء پر ایسا عقیدہ اختیار کیا جا سکتا ہے؟ یہ کیسا کھلم کھلا ظلم اور عظیم انحراف ہے؟

ان توحید پرست جواں مردوں نے بہت کوشش کی کہ لوگوں کے دلوں سے شرک کا زنگ اتر جائے اور ان کے دلوں میں توحید کی کونپل پھوٹ پڑے لیکن وہاں تو بتوں اور بت پرستی کا ایسا شور تھا اور ظالم بادشاہ کے ظلم بے داد کا ایسا خوف تھا کہ گویا سانس مخلوق خدا کے سینے میں گھٹ کے رہ گئی تھی اور نغمہ توحید ان کے حلق میں ہی اٹک کر رہ گیا تھا۔

لہٰذا انھوں نے مجبوراً اپنی نجات کے لئے اور بہتر ماحول کی تلاش کے لئے ہجرت کا عزم کیا۔ لہٰذا باہمی مشورے ہونے لگے کہ کہاں جائیں، کس طرف کو کوچ کریں۔ آپس میں کہنے لگے: ''جب اس بت پرست قوم سے کنارہ کشی اختیار کر لو خدا کو چھوڑ کر جنہیں یہ پوجتے ہیں ان سے الگ ہو جاؤ اور اپنا حساب کتاب ان سے جدا کر لو تو غار میں جا پناہ لو''

تا کہ تمہارا پروردگار تم پر اپنی رحمت کا سایہ کر دے اور اس مشکل سے نکال کر تمہیں نجات کی راہ پر لگا دے۔

''غار'' ایک پناہ گاہ

''کہف'' ایک معنی خیز لفظ ہے، اس سے انسان کی بالکل ابتدائی طرز زندگی کی طرف ذہن چلا جاتا ہے، وہ ماحول کہ جب

---

[1] سورہ کہف آیت 13

[2] سورہ کہف آیت 13

[3] سورہ کہف آیت 14

[4] سورہ کہف آیت 15

[5] سورہ کہف آیت 15

راتیں تاریک اور سرد تھیں۔ روشنی سے محروم انسان جانکاہ دروں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ زندگی جس میں مادی آسائشوں کا کوئی پتہ نہ تھا۔ جب نہ نرم بستر تھے نہ خوشحالی۔

اب جب اس طرف توجہ کہ جیسا تاریخ میں منقول ہے اصحاب کہف اس دور میں بادشاہ کے وزیر اور بہت بڑے اہل منصب تھے۔ انہوں نے بادشاہ اور اس کے مذہب کے خلاف قیام کیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ناز و نعمت سے بھری اس زندگی کو چھوڑنا کس قدر عزم، حوصلہ دلیری اور جانثاری کا غماز ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی روح کتنی عظیم تھی۔

یہ تاریک غار، سرد اور خاموش ضرور تھی اور اس میں موذی جانوروں کا خطرہ بھی تھا لیکن یہاں نور و صفا اور توحید و معنویت کی ایک دنیا آباد تھی۔

رحمت الٰہی کے نور کی لکیروں نے اس کی دیواروں پر گویا نقش و نگار کر دیا تھا اور لطف الٰہی کے آثار اس میں موجزن تھے۔ اس میں طرح طرح کے مضحکہ خیز بت نہیں تھے اور ظالم بادشاہ کا ہاتھ وہاں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس کی فضا نے جہل و جرم کے دم گھٹنے والے ماحول سے نجات عطا کر دی تھی اور یہاں انسانی فکر پر کوئی پابندی نہ تھی، فکر و آزادی اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ موجود تھی۔

جی ہاں ان خدا پرست جواں مردوں نے اس دنیا کو ترک کر دیا کہ جو اپنی وسعت کے باوجود ایک تکلیف دہ قید خانہ کی مانند تھی اور اس کو انتخاب کر لیا کہ جو اپنی تنگی و تاریکی کے باوجود وسیع تھی۔

بالکل پاکباز یوسف علیہ السلام کی طرح کہ جنہوں نے عزیز مصر کی خوبصورت بیوی کے شدید اصرار کے باوجود اس کی سرکش ہوس کے سامنے سر نہ جھکایا اور تاریک و خوف ناک قید خانے میں جانا قبول کر لیا۔ اللہ نے ان کی استقامت و پامردی میں اضافہ کر دیا اور آخر کار انہوں نے بارگاہ خداوندی میں یہ حیران کن جملہ کہا: ''پروردگارا یہ قید خانہ اپنی جانکاہ تنگی و تاریکی کے باوجود مجھے اس گناہ سے زیادہ محبوب ہے کہ جس کی طرف یہ عورتیں مجھے دعوت دیتی ہیں اور اگر تو ان کے وسوسوں کو مجھ سے دفع نہ کرے تو میں ان کے دام میں گرفتار ہو جاؤں گا''۔ [1]

اصحاب کہف کا اہم مقام

قرآن اصحاب کہف کی عجیب و غریب زندگی کی کچھ تفصیلات بیان کر رہا ہے۔ ان کی زندگی کی ایسی منظر کشی کی گئی ہے کہ گویا کوئی شخص ان کے سامنے بیٹھا ہے اور غار میں سوئے ہوئے افراد کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

سورہ کہف میں چھ نشانیاں اور خصوصیات بیان کی گئی ہیں:

1۔ غار کا دہانہ شمال کی طرف ہے اور چونکہ زمین کے شمالی نصف کرہ میں واقع تھی لہٰذا سورج کی روشنی مستقیم اس میں نہیں پڑتی تھی۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ''اگر تو وقت طلوع سورج کو دیکھتا تو وہ ان کی دائیں جانب جھک کے گزرتا ہے اور غروب کے وقت بائیں جانب''۔ [2] غار کا دہانہ شمال کی طرف ہونے کی وجہ سے اس میں اچھی ہوائیں آتی تھیں کیونکہ یہ ہوائیں عموماً شمال کی جانب سے چلتی ہیں۔ لہٰذا تازہ ہوا آسانی سے میں داخل ہو جاتی اور ایک تازگی قائم رکھتی۔

2۔ ''وہ کی ایک وسیع جگہ میں تھے''۔ [3]

---

[1] سورہ کہف آیت 15

[2] سورہ یوسف آیت 33

[3] سورہ کہف آیت 17

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ کے دہانے پر موجود نہ تھے کیونکہ وہ تو عموماً تنگ ہوتا ہے۔ وہ کے وسطی حصے میں تھے تا کہ دیکھنے والوں کی نظروں سے بھی اوجھل رہیں اور سورج کی براہ راست چمک سے بھی۔

3۔''ان کی نیند عام نیند جیسی نہ تھی''۔''اگر تو انہیں دیکھتا تو خیال کرتا کہ وہ بیدار ہیں حالانکہ وہ گہری نیند میں سوئے ہوئے تھے''۔[1]

یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ ان کی آنکھیں بالکل ایک بیدار شخص کی طرح پوری طرح کھلی تھیں۔ یہ استثنائی حالت شاید اس بناء پر تھی کہ موذی جانور قریب نہ آئیں کیونکہ وہ بیدار آدمی سے ڈرتے ہیں۔ یا اس کی وجہ یہ تھی کہ ماحول رعب انگیز رہے تا کہ کوئی انسان ان کے پاس جانے کی جرأت نہ کرے اور یہ صورت حال ان کے لئے ایک سپر کا کام دے۔

4۔''اس بناء پر کہ سالہا سال سوئے رہنے کی وجہ سے ان کے جسم بوسیدہ نہ ہوجائیں''۔ہم انہیں دائیں بائیں کروٹیں بدلواتے رہتے تھے۔[2]

تا کہ ان کے بدن کا خون ایک ہی جگہ نہ ٹھہر جائے اور طویل عرصہ تک ایک طرف ٹھہرنے کی وجہ سے ان کے اعصاب خراب نہ ہوجائیں۔

5۔''اس دوران میں ان کا کتا کہ جو ان کے ہمراہ تھا کے دہانے پر اپنے اگلے پاؤں پھیلائے ہوئے تھا اور پہرہ دے رہا تھا''۔[3]

اس سے پہلے ابھی تک قرآنی آیات میں اصحاب کہف کے کتے کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی لیکن قرآن واقعات کے دوران بعض اوقات ایسی باتیں کرجاتا ہے کہ جن سے دوسرے مسائل بھی واضح ہوجاتے ہیں۔اسی طرح یہاں اصحاب کہف کے کتے کا ذکر آیا ہے، یہاں سے ظاہر ہوا کہ ان کے ہمراہ ایک کتا بھی تھا جو ان کے ساتھ ساتھ رہتا تھا اور ان کی حفاظت کرتا تھا۔

یہ کہ یہ کتا ان کے ساتھ کہاں سے شامل ہوا تھا، کیا ان کا شکاری کتا تھا یا اس چرواہے کا کتا تھا کہ جس سے ان کی راستے میں ملاقات ہوئی تھی اور جب چرواہے نے انہیں پہچان لیا تھا تو اس نے اپنے جانور آبادی کی طرف روانہ کردیئے تھے اور خود ان پاکباز لوگوں کے ساتھ ہولیا تھا کیونکہ وہ ایک حق تلاش اور دیدار الٰہی کا طالب انسان تھا۔اس وقت کتا ان سے جدا نہ ہوا اور ان کے ساتھ ہولیا۔

کیا اس بات کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ تمام عاشقان حق اس تک رسائی کے لئے اس کے راستے میں قدم رکھ سکتے ہیں اور کوئے یار کے دروازے کسی کے لئے بند نہیں ہیں۔ظالم بادشاہ کے تائب ہونے والے وزیروں سے لے کر چرواہے تک بلکہ اس کے کتے تک کے لئے بارگاہ الٰہی کے دروازے کھلے ہیں۔

کیا ایسا نہیں ہے؟، قرآن کہتا ہے:''زمین وآسمان کے تمام ذرے، سارے درخت اور سب چلنے پھرنے والے ذکر الٰہی میں مگن ہیں، سب کے سر میں اس کے عشق کا سودا سمایا ہے اور سب کے دلوں میں اس کی محبت جلوہ گر ہے''۔[4]

---

[1] سورہ کہف آیت 17

[2] سورہ کہف آیت 18

[3] سورہ کہف آیت 18

[4] سورہ کہف آیت 18

6۔ غار میں اصحاب کہف کا منظر ایسا رعب دار تھا کہ اگر تو انہیں جھانک کے دیکھ لیتا تو بھاگ کھڑا ہوتا اور تیرا وجود سرتا پا خوفزدہ ہو جاتا''۔[1]

''یہ ایک ہی موقع نہیں کہ خدا متعال نے رعب اور خوف کو اپنے باایمان بندوں کے لئے ڈھال بنایا تھا۔ بلکہ دوسری جگہ بھی اس طرح کا خطاب ہوا ہے۔''ہم جلد ہی کافروں کے دلوں پر رعب ڈال دیں گے۔''[2]

دعائے ندبہ اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں منقول ہے:''خداوندا پھر تو نے اپنے پیغمبر کی مدد اس طرح کی کہ اس کے دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈال دیا''۔

لیکن یہ رعب کہ جو اصحاب کہف کو دیکھنے والے کو سرتا پا لرزا دیتا، ان کی جسمانی حالت کے باعث تھا یا یہ کہ پراسرار روحانی طاقت تھی کہ جو اس سلسلے میں کام کر رہی تھی۔ اس سلسلے میں آیات قرآنی میں کوئی وضاحت نہیں ہے''۔

ایک طویل نیند کے بعد بیداری

اصحاب کہف کی نیند اتنی لمبی ہوگئی کہ وہ تین سو نو سال تک سوئے رہے اور ان کی نیند موت سے بالکل ملتی جلتی تھی اور ان کی بیداری بھی قیامت کی مانند تھی۔ لہٰذا قرآن کہتا ہے:''اور ہم نے انہیں اسی طرح اٹھا کھڑا کیا''۔[3]

یعنی اسی طرح کہ جیسے ہم اس پر قادر تھے کہ انہیں لمبی مدت تک سلائے رکھتے اور انہیں پھر سے بیدار کرنے پر بھی قادر تھے۔

ہم نے انہیں نیند سے بیدار کر دیا، تا کہ وہ ایک دوسرے سے پوچھیں، ان میں سے ایک نے پوچھا۔ تمہارا خیال ہے کتنی مدت سوئے ہو؟ انہوں نے کہا:''ایک دن یا دن کا کچھ حصہ''۔[4]

اس میں تردد شاید انہیں اس لے ہوا کہ جیسے مفسرین نے کہا ہے کہ وہ جب غار میں آئے تھے تو دن کا ابتدائی حصہ تھا اور آ کر وہ سو گئے تھے اور جب اٹھے تو دن کا آخری حصہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے انہوں نے سوچا کہ شاید ایک دن سو گئے اور جب انہوں نے سورج کی طرف دیکھا تو انہیں خیال آیا کہ شاید دن کا کچھ حصہ سوئے ہیں۔

لیکن آخرکار چونکہ انہیں صحیح طرح سے معلوم نہ ہو سکا کہ کتنی دیر سوئے ہیں لہٰذا کہنے لگے: تمہارا رب بہتر جانتا ہے کہ کتنی دیر سوئے ہو۔[5]

بعض کا کہنا ہے کہ یہ بات ان میں سے بڑے نے کہی جس کا نام ''تملیخا'' تھا اور یہاں پر''قالوا''[6] کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کہ جو جمع کا صیغہ ہے اس کا استعمال ایک معمول جیسی بات ہے۔

یہ بات انہوں نے شاید اس لئے کہی کہ ان کے چہرے سے، ناخنوں سے، بالوں سے اور لباس سے بالکل شک نہیں پڑتا تھا

---

[1] بنی اسرائیل آیت 44
[2] سورہ کہف آیت 18
[3] سورہ آل عمران آیت 151
[4] سورہ کہف آیت 19
[5] سورہ کہف آیت 19
[6] سورہ کہف آیت 19

کہ وہ کوئی غیر معمولی طور پر نیند میں رہے ہیں۔

بہر حال انہیں بھوک اور پیاس کا احساس ہوا کیونکہ ان کے بدن میں جو غذا تھی وہ تو تمام ہو چکی تھی، لہٰذا پہلے انہوں نے یہی تجویز کی کہ ''تمہارے پاس چاندی کا جو سکہ ہے اپنے میں سے ایک کو دو تا کہ وہ جائے اور دیکھے کہ کس کے پاس اچھی پاکیزہ غذا ہے اور جتنی تمہیں چاہئے تمہارے لئے لے آئے''۔ [1]

''لیکن بہت احتیاط سے جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی کو تمہارے بارے میں کچھ بتا بیٹھے''۔ [2]

''کیونکہ اگر انہیں تمہارے بارے میں پتہ چل گیا اور انہوں نے تمہیں آلیا تو سنگسار کر دیں گے یا پھر تمہیں اپنے دین (بت پرستی) کی طرف موڑ لے جائیں گے،'' اور اگر ایسا ہو گیا تو تم نجات اور فلاح کا منہ نہ دیکھ پاؤ گے''۔ [3]

پاکیزہ ترین غذا

یہ بات بہت جاذب نظر ہے کہ اس داستان میں ہم نے پڑھا ہے کہ اصحاب کہف جب بیدار ہوئے تو ظاہر ہے انہیں بہت بھوک لگ رہی تھی اور اس طویل مدت کے دوران ان کے جسم میں جو غذا تھی، وہ ختم ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود انھوں نے جسے کھانا لانے کے لئے بھیجا اسے نصیحت کی کہ ہر غذا نہ خرید لائے بلکہ دیکھ بھال کر کھانا بیچنے والوں کے پاس سے جو سب سے زیادہ پاکیزہ ہو اسی کو لے کر آئے۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے ذبح شدہ جانور کی طرف اشارہ تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس شہر میں ایسے لوگ رہتے ہیں کہ جو نجس و ناپاک اور کبھی مردہ کا گوشت بیچتے ہیں یا بعض لوگوں کا کام ہی حرام کا تھا لہٰذا انہوں نے نصیحت کی ایسے لوگوں سے کھانا نہ خریدنا۔

لیکن ظاہراً اس جملے کا وسیع مفہوم ہے کہ جس میں ہر قسم کی ظاہری اور باطنی پاکیزگی شامل ہے۔

بہر حال جلد ہی لوگوں میں ان عظیم جواں مردوں کی ہجرت کی داستان پھیل گئی۔ ظالم بادشاہ سیخ پا ہو گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی ہجرت یا بھاگ نکلنا لوگوں کی بیداری اور آگاہی کا سبب بن جائے، اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں وہ دور یا نزدیک کے علاقے میں جا کر لوگوں کو دین توحید کی تبلیغ نہ کرنے لگیں اور شرک و بت پرستی کے خلاف جدوجہد شروع کر دیں۔ لہٰذا اس نے خاص افراد کو مامور کیا کہ انہیں ہر جگہ تلاش کیا جائے اور ان کا کچھ اتہ پتہ معلوم ہو تو گرفتار کے لئے تعاقب کیا جائے اور انہیں سزا دی جائے۔

لیکن انہوں نے جتنی بھی کوشش کی کچھ نہ پایا اور یہ امر خود علاقے کے لوگوں کے لئے ایک معمہ اور ان کے دل و دماغ کے لئے ایک خاص نقطہ بن گیا۔ نیز یہ امر کہ حکومت کے نہایت اہم چند ارا کین نے ہر چیز کو ٹھوکر ماردی اور طرح طرح کے خطرات مول لے لئے شاید بعض لوگوں کی بیداری اور آگاہی کا سرچشمہ بن گیا۔

بہر حال ان افراد کی یہ حیران کن داستان ان کی تاریخ میں ثبت ہو گئی اور ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل ہونے لگی۔ اور اسی طرح اس مسئلے کو صدیاں گزر گئیں۔

---

[1] سورہ کہف آیت 19

[2] سورہ کہف آیت 19

[3] سورہ کہف آیت 20

سامان خریدنے والے پر کیا گزری

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ اس پر کیا گزری جو غذا لینے کے لئے آیا۔ وہ شہر میں داخل ہوا تو اس کا منہ تعجب سے کھلے کا کھلا رہ گیا، شہر کی عمارتوں کی شکل وصورت تمام تبدیل ہو چکی تھی، سب چہرے ناشناس تھے، لباس نئے انداز کے تھے اور جہاں پہلے محل تھے وہاں ویرانے تھے۔

شاید تھوڑی دیر کے لئے اس نے سوچا ہو کہ ابھی میں نیند میں ہوں اور یہ جو کچھ دیکھ رہا ہوں سب خواب ہے۔ اس نے اپنی آنکھوں کو ملا۔ وہ سب چیزوں کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ کیسی حقیقت ہے کہ جس پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔

اب وہ سوچنے لگا کہ وہ میں ایک یا آدھا دن سوئے ہیں تو پھر یہ اتنی تبدیلیاں اتنی مدت میں کیسے ممکن ہیں؟

دوسری طرف اس کا چہرہ مہرہ اور حالت لوگوں کے لئے بھی عجیب اور غیر مانوس تھی۔ اس کا لباس، اس کی گفتار اور اس کا چہرہ سب نیا معلوم ہوتا تھا شاید اسی وجہ سے کچھ لوگ اسکی طرف متوجہ ہوئے اور اس کے پیچھے چل پڑے۔

اس وقت لوگوں کا تعجب انتہاء کو پہنچ گیا جب اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تا کہ اس کھانے کی قیمت ادا کرے جو اس نے خریدا تھا، دکاندار کی نگاہ سکے پر پڑی وہ تین سو سال سے زیادہ پرانے دور کا تھا اور شاید اس زمانے کے ظالم بادشاہ دقیانوس کا نام بھی اس پر کندہ تھا۔ جب اس نے وضاحت چاہی تو خریدار نے جواب میں کہا: میرے ہاتھ میں تو یہ سکہ ابھی تازہ ہی آیا ہے۔

قرائن اور احوال سے لوگوں کو آہستہ آہستہ یقین ہو گیا کہ یہ شخص تو انہی افراد میں سے ہے جن کا ذکر ہم نے تین سو سال پہلے کی تاریخ میں پڑھا ہے اور بہت سی محفلوں میں ہم نے جن کی پراسرار داستان سنی ہے۔

خود اسے بھی احساس ہوا کہ وہ اور اس کے ساتھی گہری اور طولانی نیند میں مستغرق رہے ہیں۔ اس بات کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں آن کی آن میں پھیل گئی۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں ایک نیک اور خدا پرست بادشاہ حکومت کرتا تھا لیکن معاد جسمانی اور موت کے بعد مردوں کے جی اٹھنے کے مسئلہ پر یقین کرنا وہاں کے لوگوں کے لئے مشکل تھا۔ ان میں سے ایک گروہ کو اس بات پر یقین نہیں آتا تھا کہ انسان مرنے کے بعد پھر جی اٹھے گا لیکن اصحاب کہف کی نیند کا واقعہ معاد جسمانی کے طرفداروں کے لئے ایک دندان شکن دلیل بن گیا۔

اسی لئے قرآن کہتا ہے: ''جیسے ہم نے انہیں سلا دیا تھا اسی طرح انہیں اس گہری اور طویل نیند سے بیدار کیا اور لوگوں کو ان کے حال کی طرف متوجہ کیا تا کہ وہ جان لیں کہ قیامت کے بارے میں خدا کا وعدہ حق ہے۔ اور دنیا کے خاتمے اور قیام قیامت میں کوئی شک نہیں''۔ [1]

کیونکہ صدیوں پر محیط یہ لمبی نیند موت سے غیر مشابہ نہیں ہے اور ان کا بیدار ہونا قبروں سے اٹھنے کی مانند ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سونا اور جاگنا کئی حوالوں سے مرنے اور پھر جی اٹھنے سے عجیب تر ہے کیونکہ وہ صدیوں سوئے رہے لیکن ان کا بدن بوسیدہ نہ ہوا جبکہ انہوں نے کچھ کھایا نہ پیا، تو پھر وہ اتنی لمبی مدت زندہ کس طرح رہے۔

کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ خدا ہر چیز اور ہر کام پر قادر ہے۔ ایسے منظر کی طرف نظر کی جائے تو موت کے بعد زندگی کا

---

[1] سورہ کہف آیت 21

مسئلہ کوئی عجیب معلوم نہیں ہوتا بلکہ یقینی طور پر ممکن دکھائی دیتا ہے۔

اصحاب کہف کے واقعہ کا اختتام

جو شخص غذا لینے شہر میں آیا تھا اس نے یہ صورت دیکھی تو جلدی سے غار کی طرف پلٹا اور اپنے دوستوں کو سارا حال سنایا، وہ سب کے سب گہرے تعجب میں ڈوب گئے۔ اب انہیں احساس ہوا کہ ان کے تمام بچے، بھائی اور دوست کوئی بھی باقی نہیں رہا اور ان کے احباب وانصار میں سے کوئی نہیں رہا۔ ایسے میں ان کو یہ زندگی بہت سخت اور ناگوار لگی۔ لہٰذا انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ اس جہان سے ہماری آنکھیں بند ہو جائیں اور ہم جوار رحمت حق میں منتقل ہو جائیں۔

ایسا ہی ہوا، اس دنیا سے انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ان کے جسم غار میں پڑے تھے کہ لوگ ان کی تلاش کو نکلے۔[1]

اس مقام پر معاد جسمانی کے طرفداروں اور مخالفوں کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی۔

مخالفین کی کوشش تھی کہ لوگ اصحاب کہف کے سونے اور جاگنے کے مسئلہ کو جلد بھول جائیں ''لہٰذا انہوں نے تجویز پیش کی کہ غار کا دروازہ بند کر دیا جائے تا کہ وہ ہمیشہ کے لئے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں''۔[2]

وہ لوگوں کو خاموش ہونے کے لئے کہتے تھے کہ ان کے بارے میں زیادہ باتیں نہ کرو، ان کی داستان اسرار آمیز ہے ''ان کا پروردگار ان کی کیفیت سے زیادہ آگاہ ہے''۔[3]

لہٰذا ان کا قصہ ان تک رہنے دو اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔

جبکہ حقیقی مومن کہ جنہیں اس واقعے کی خبر ہوئی اور جو اسے قیامت کے حقیقی مفہوم کے اثبات کے لئے ایک زندہ دلیل سمجھتے تھے، ان کی کوشش تھی کہ یہ واقعہ ہرگز فراموش نہ ہونے پائے۔ لہٰذا انہوں نے کہا: ''ہم ان کے مدفن کے پاس مسجد بناتے ہیں''۔[4]

تا کہ لوگ انہیں اپنے دلوں سے ہرگز فراموش نہ کریں علاوہ ازیں ان کی ارواح پاک سے لوگ استمداد کریں۔

قرآن میں ان چند اختلافات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، کہ جو اصحاب کہف کے بارے میں لوگوں میں پائے جاتے ہیں، ان میں سے ایک ان کی تعداد کے بارے میں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ''بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا''۔

بعض کہتے ہیں کہ وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔

یہ سب بلا دلیل باتیں ہیں اور اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف ہیں۔

اور بعض کہتے ہیں کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتّا تھا۔

کہہ دے: میرا رب ان کی تعداد بہتر جانتا ہے۔

صرف تھوڑے سے لوگ ان کی تعداد جانتے ہیں۔[5]

قرآن نے ان جملوں میں اگرچہ صراحت سے ان کی تعداد بیان نہیں کی لیکن آیت میں موجود بعض اشاروں سے سمجھا

---

[1] سورہ کہف آیت 21

[2] سورہ کہف آیت 21

[3] سورہ کہف آیت 21

[4] سورہ کہف آیت 21

[5] سورہ کہف آیت 22

جاسکتا ہے کہ تیسرا قول صحیح اور مطابق حقیقت ہے کیونکہ پہلے اور دوسرے قول کے بعد (اندھیرے میں تیر مارنا) آیا ہے کہ جو ان اقوال کے لئے بے بنیاد ہونے کی طرف اشارہ ہے لیکن تیسرے قول کے بارے میں نہ صرف ایسی کوئی تعبیر نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی فرمایا گیا ہے: کہہ دے: ''میرا رب ان کی تعداد سے بہتر طور پر آگاہ ہے''۔ اور یہ بھی فرمایا گیا ہے ''ان کی تعداد کو تھوڑے سے لوگ جانتے ہیں''۔ یہ جملے بھی اس تیسرے قول کی صداقت پر دلالت کرتے ہیں۔

بہرحال آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: ''استدلالی اور منطقی گفتگو کے علاوہ ان کے بارے میں بحث نہ کر''۔[1]

بہرحال اس گفتگو کا مفہوم یہ ہے کہ وحی خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے۔ تو ان کے ساتھ بات کر کیونکہ اس سلسلے میں محکم ترین دلیل یہی ہے۔ ''لہٰذا جو لوگ بغیر دلیل کے اصحاب کہف کی تعداد کے بارے میں بات کرتے ہیں ان سے اس بارے میں سوال نہ کر''۔[2]

اصحاب کہف کی نیند

قرآن میں موجودہ قرائن سے اجمالاً معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب کہف کی نیند بہت لمبی تھی۔ یہ بات ہر شخص کی حس جستجو کو ابھارتی ہے۔ ہر شخص جاننا چاہتا ہے کہ وہ کتنے برس سوئے رہے۔

قرآن اس داستان کے متعلق تردد کو ختم کرتے ہوئے آخر میں اس سوال کا جواب دیتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: ''وہ اپنی غار میں تین سو سے نو برس زیادہ سوتے رہے''۔[3]

اس لحاظ سے وہ کل تین سو نو سال غار میں سوئے رہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تین سو نو سال کہنے کی بجائے یہ جو کہا 300 سال، نو سال اس سے زیادہ، یہ شمسی اور قمری سالوں کے فرق کی طرف اشارہ ہے کیونکہ شمسی حساب سے وہ تین سو سال رہے جو قمری حساب سے تین سو نو سال ہوئے اور یہ تعبیر کا ایک لطیف پہلو ہے کہ ایک جزوی تعبیر کے ذریعے عبارت میں ایک اور وضاحت طلب حقیقت بیان کر دی جائے۔

اس کے بعد اس بارے میں لوگوں کے اختلاف آراء کو ختم کرنے کے لئے فرمایا گیا ہے: ''کہہ دیجئے: خدا ان کے قیام کی مدت کو بہتر جانتا ہے۔ کیونکہ آسمانوں اور زمین کے غیب کے احوال اس کے سامنے ہیں''۔[4] اور وہ ہر کسی کی نسبت انہیں زیادہ جانتا ہے۔

اور جو کل کائنات ہستی سے باخبر ہے کیونکر ممکن ہے کہ وہ اصحاب کہف کے غار میں قیام کی مدت سے آگاہ نہ ہو۔

غار کہاں ہے؟

یہ کہ اصحاب کہف کس علاقے میں رہتے تھے اور یہ غار کہاں تھی؟ اس سلسلے میں علماء اور مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے، البتہ اس واقعے کے مقام کو صحیح طور پر جاننے کا اصل داستان، اس کے تربیتی پہلوؤں اور تاریخی اہمیت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا، یہ

---

[1] سورہ کہف آیت 22

[2] سورہ کہف آیت 22

[3] سورہ کہف آیت 25

[4] سورہ کہف آیت 26

کوئی واحد واقعہ نہیں کہ جس کی اصل داستان تو ہمیں معلوم ہے لیکن اس کی زیادہ تفصیلات معلوم نہیں ہیں، لیکن مسلم ہے کہ اس واقعے کا مقام جاننے سے اس کی خصوصیات کو مزید سمجھنے کے لئے مفید ہوسکتا ہے۔

بہر حال اس سلسلے میں جو احتمالات ذکر کیے گئے اور جو اقوال نظر سے گزرے ہیں ان میں سے دو زیادہ صحیح معلوم ہوتے ہیں۔

پہلا یہ کہ یہ واقعہ شہر ''افسوس'' میں ہوا اور یہ اس شہر کے قریب واقع تھی۔ ترکی میں اب بھی اس شہر کے کھنڈرات ''ازمیر'' کے قریب نظر آتے ہیں۔ وہاں قریب ایک قصبہ ہے جس کا نام ''ایاصولوک'' ہے اس کے پاس ایک پہاڑ ہے ''پنایرداغ''۔ اب بھی اس میں ایک نظر آتی ہے جو افسوس شہر سے کوئی زیادہ فاصلہ پر نہیں ہے، یہ ایک وسیع غار ہے، کہتے ہیں اس میں سینکڑوں قبروں کے آثار نظر آتے ہیں، بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اصحاب کہف کی یہی غار ہے۔

جیسا کہ جاننے والوں نے بیان کیا ہے کہ اس کا دہانہ شمال مشرق کی جانب ہے۔ اس وجہ سے بعض بزرگ مفسرین نے اس بارے میں شک کیا ہے کہ یہ وہی غار ہے، حالانکہ اس کی یہی کیفیت اس کے اصلی ہونے کی موید ہے کیونکہ طلوع کے وقت سورج کا دائیں طرف اور غروب کے وقت بائیں طرف ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ غار کا دہانہ شمال یا کچھ شمال مشرق کی جانب ہو۔

اس وقت وہاں کسی مسجد یا عبادت خانہ کا نہ ہونا بھی اسکے وہی غار ہونے کی نفی نہیں کرتا کیونکہ تقریباً سترہ صدیاں گزرنے کے بعد ممکن ہے اس کے آثار مٹ گئے ہوں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ وہ غار ہے کہ جو ''اردن'' کے دارالحکومت ''عمان'' میں واقع ہے۔ یہ ''رجیب'' نامی ایک بستی کے قریب ہے اس کے اوپر گرجے کے آثار نظر آتے ہیں۔ بعض قرائن کے مطابق ان کا تعلق پانچویں صدی عیسوی سے ہے۔ جب اس علاقے پر مسلمانوں کا غلبہ ہوا تو اسے مسجد میں تبدیل کرلیا گیا تھا اور وہاں محراب بنائی گئی تھی اور آذان کی جگہ کا اضافہ کیا گیا تھا۔ یہ دونوں اس وقت موجود ہیں۔

اصحاب کہف کا واقعہ دیگر تواریخ میں

یہ بات مسلم ہے کہ اصحاب کہف کا واقعہ کسی گزشتہ آسمانی کتاب میں نہیں تھا (چاہے وہ اصلی ہو یا موجودہ تحریف شدہ) اور نہ اسے کتابوں میں ہونا ہی چاہئے تھا کیونکہ تاریخ کے مطابق یہ واقعہ ظہور مسیح علیہ السلام کے صدیوں بعد کا ہے۔

یہ واقعہ ''دکیوس'' کے دور کا ہے، جسے عرب ''دقیانوس'' کہتے ہیں۔ اس کے زمانے میں عیسائیوں پر سخت ظلم ہوتا تھا۔

یورپی مؤرخین کے مطابق یہ واقعہ 49 تا 152 عیسوی کے درمیان کا ہے۔ ان مؤرخین کے خیال میں اصحاب کہف کی نیند کی مدت 157 سال ہے۔ یورپی مؤرخین انہیں ''افسوس کے 7 سونے والے'' کہتے ہیں۔ جبکہ ہمارے ہاں انہیں ''اصحاب کہف'' کہا جاتا ہے۔

اب دیکھتے ہیں کہ ''افسوس'' شہر کہاں ہے؟ سب سے پہلے کن علماء نے ان سونے والوں کے بارے میں کتاب لکھی اور وہ کس صدی کے تھے؟

''افسوس'' یا ''اُفسُس'' ایشیائے کوچک کا ایک شہر تھا (موجودہ ترکی جو قدیم مشرقی روم کا ایک حصہ تھا) یہ ''دریائے کاستر'' کے پاس ''ازمیر'' شہر کے تقریباً چالیس میل جنوب مشرق میں واقع تھا۔ یہ ''الونی'' بادشاہ کا پایہ تخت شمار ہوتا تھا۔

افسوس اپنے مشہور بت خانے اور ''طامیس'' کی وجہ سے بھی عالمی شہرت رکھتا تھا۔ یہ دنیا کے سات عجائبات میں سے تھا۔

کہتے ہیں کہ اصحاب کہف کی داستان پہلی مرتبہ پانچویں صدی عیسوی میں ایک عیسائی عالم نے لکھی۔اس کا نام ''اک'' تھا۔وہ شام کے ایک گرجے کا متولی تھا۔اس نے سریانی زبان کے ایک رسالے میں اس کے بارے میں لکھا تھا۔اس کے بعد ایک اور شخص نے اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا۔اس کا نام ''گوگویوس'' تھا ترجمے کا نام اس نے ''جلال شہداء'' کا ہم معنی رکھا تھا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ظہور اسلام سے ایک دوصدیاں پہلے یہ واقعہ عیسائیوں میں مشہور تھا اور گرجوں کی مجالس میں اس کا تذکرہ ہوتا تھا۔

البتہ جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے، اسلامی مصادر میں اس کی جو تفصیلات آئی ہیں وہ مذکورہ عیسائیوں کے بیانات سے کچھ مختلف ہیں۔جیسے ان کے سونے کی مدت کیونکہ قرآن نے صراحت کے ساتھ یہ مدت 309 سال بیان کی ہے۔

''یاقوت حموی'' نے اپنی کتاب ''معجم البلدان ج 2 ص 6 0 8 پر'' خرداد بہ نے اپنی کتاب ''المسالک والممالک'' ص106 تا110 میں اور ''ابوریحان بیرونی'' نے اپنی کتاب ''الاثار الباقیہ'' ص290 پر نقل کیا ہے کہ قدیم سیاحوں کی ایک جماعت نے شہر ''آبس'' میں ایک غار دیکھی ہے جس میں چند انسانی ڈھانچے پڑے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ ہوسکتا ہے یہ بات اسی داستان سے مربوط ہو۔

سورہ کہف میں قرآن کے لب ولہجہ سے اور اس سلسلے میں اسلامی کتب میں منقول شان ہائے نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ داستان یہودی علماء میں بھی ایک تاریخی واقعے کے طور پر مشہور تھی، اس سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ طولانی نیند کا یہ واقعہ مختلف قوموں کی تاریخی ماخذ میں موجود رہا ہے۔[1]

ذوالقرنین کی عجیب کہانی

چند قریشیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آزمانا چاہا، اس مقصد کے لئے انہوں نے مدینے کے یہودیوں کے مشورے سے تین مسئلے پیش کیے۔ایک اصحاب کہف کے بارے میں تھا۔دوسرا مسئلہ روح کا تھا اور تیسرا ذوالقرنین کے بارے میں۔ذوالقرنین کی داستان ایسی ہے کہ جس پر طویل عرصے سے فلاسفہ اور محققین غور وخوض کرتے چلے آئے ہیں اور ذوالقرنین کی معرفت کے لئے انہوں نے بہت کوشش کی ہے۔

اس سلسلے میں پہلے ہم ذوالقرنین سے مربوط جو قرآن میں بیان ہوا ہے وہ بیان کرتے ہیں۔کیونکہ تاریخی تحقیق سے قطع نظر ذوالقرنین کی ذات خود سے ایک بہت ہی تربیتی درس کی حامل ہے اور اس کے بہت سے قابل غور پہلو ہیں۔اس کے بعد ذوالقرنین کی شخصیت کو جاننے کے لئے ہم آیات، روایات اور مؤرخین کے اقوال کا جائزہ لیں گے۔

دوسرے لفظوں میں پہلے ہم اس کی شخصیت کے بارے میں گفتگو کریں گے اور پہلا موضوع وہی ہے جو قرآن کی نظر میں اہم ہے۔اس سلسلے میں قرآن کہتا ہے: ''تجھ سے ذوالقرنین کے بارے میں سوال کرتے ہیں: کہہ دو عنقریب اس کی سرگزشت کا کچھ

---

[1] اصحاب کہف کا واقعہ کیا سائنس کے لحاظ سے قابل قبول ہے؟ رجوع کریں تفسیر نمونہ جلد 7 ص86۔

حصہ تم سے بیان کروں گا''۔[1]

بہر حال یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ پہلے بھی ذوالقرنین کے بارے میں بات کیا کرتے تھے۔ البتہ اس سلسلے میں ان میں اختلاف اور ابہام پایا جاتا تھا۔ اسی لئے انہوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ضروری وضاحتیں چاہیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: ''ہم نے اسے زمین پر تمکنت عطا کی (قدرت، ثبات قوت اور حکومت بخشی)۔ اور ہر طرح کے وسائل اور اسباب اس کے اختیار میں دیئے۔ اس نے بھی ان سے استفادہ کیا۔ یہاں تک کہ وہ سورج کے مقام غروب تک پہنچ گیا۔ وہاں اس نے محسوس کیا کہ سورج تاریک اور کیچڑ آلود چشمے یا دریا میں ڈوب جاتا ہے''۔[2]

وہاں اس نے ایک قوم کو دیکھا (کہ جس میں اچھے برے ہر طرح کے لوگ تھے) ''تو ہم نے ذوالقرنین سے کہا: کہ تم انہیں سزا دینا چاہو گے یا اچھی جزا''۔[3]

ذوالقرنین نے کہا: ''وہ لوگ کہ جنہوں نے ظلم کیے ہیں، انہیں تو ہم سزا دیں گے۔ اور وہ اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جائیں گے اور اللہ انہیں شدید عذاب کرے گا''۔[4]

یہ ظالم وستمگر دنیا کا عذاب بھی چکھیں گے اور آخرت کا بھی۔

''اور رہا وہ شخص کہ جو با ایمان ہے اور عمل صالح کرتا ہے اسے اچھی جزاء ملے گی۔ اور اسے ہم آسان کام سونپیں گے''۔[5]

اس سے بات بھی محبت سے کریں گے اور اس کے کندھے پر سخت ذمہ داریاں بھی نہیں رکھیں گے اور اس سے زیادہ خراج بھی وصول نہیں کریں گے۔

ذوالقرنین کے اس بیان سے گویا یہ مراد تھی کہ توحید پر ایمان اور ظلم وشرک اور برائی کے خلاف جدوجہد کے بارے میں میری دعوت پر لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہوگا جو اس الٰہی تعمیری پروگرام کو مطمئن ہو کر تسلیم کر لیں گے انہیں اچھی جزا ملے گی اور وہ آرام وسکون سے زندگی گزاریں گے جبکہ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہوگا جو اس دعوت سے دشمنی پر اتر آئیں گے اور شرک وظلم اور برائی کے راستے پر ہی قائم رہیں گے انہیں سزا دی جائے گی۔

ذوالقرنین نے اپنا مغرب کا سفر تمام کیا اور مشرق کی طرف جانے کا عزم کیا اور جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ''جو وسائل اس کے اختیار میں تھے اس نے ان سے پھر استفادہ کیا۔ اور اپنا سفر اسی طرح جاری رکھا یہاں تک کہ سورج کے مرکز طلوع تک جا پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا سورج ایسے لوگوں پر طلوع کر رہا ہے کہ جن کے پاس سورج کی کرنوں کے علاوہ تن ڈھانپنے کی کوئی چیز نہیں ہے''۔[6]

یہ لوگ بہت ہی پست درجے کی زندگی گزارتے تھے یہاں تک کہ برہنہ رہتے تھے یا بہت ہی کم مقدار میں لباس پہنتے تھے

---

[1] سورہ کہف آیت 83

[2] سورہ کہف آیت 84

[3] سورہ کہف آیت 86

بعض مفسرین نے لفظ ''قلنا'' (ہم نے ذوالقرنین سے کہا) سے ان کی نبوت پر دلیل قرار دیا ہے لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ اس جملے سے قلبی الہام مراد ہو کہ جو غیر انبیاء میں بھی ہوتا ہے لیکن اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تفسیر زیادہ تر نبوت کو ظاہر کرتی ہے۔

[4] سورہ کہف آیت 87

[5] سورہ کہف آیت 88

[6] سورہ کہف آیت 89-90

کہ جس سے ان کا بدن سورج سے نہیں چھپتا تھا۔[1]

جی ہاں! ذوالقرنین کا معاملہ ایسا ہی ہے اور ہم خوب جانتے ہیں کہ اس کے اختیار میں (اپنے اہداف کے حصول کے لئے) کیا وسائل تھے۔[2]

بعض مفسرین نے یہاں یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ یہ جملہ ذوالقرنین کے کاموں اور پروگراموں میں اللہ کی ہدایت کی طرف اشارہ ہے۔

ذوالقرنین نے دیوار کیسے بنائی؟

قرآن میں حضرت ذوالقرنین علیہ السلام کے ایک اور سفر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

''اس کے بعد اس نے حاصل وسائل سے پھر استفادہ کیا''۔[3]

''اور اس طرح اپنا سفر جاری رکھا یہاں تک کہ وہ دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا وہاں ان دو گروہوں سے مختلف ایک اور گروہ کو دیکھا۔ یہ لوگ کوئی بات نہیں سمجھتے تھے''۔[4]

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ کوہستانی علاقے میں جا پہنچے۔ مشرق اور مغرب کے علاقے میں وہ جیسے لوگوں سے ملے تھے یہاں ان سے مختلف لوگ تھے، یہ لوگ انسانی تمدن کے اعتبار سے بہت ہی پسماندہ تھے کیونکہ انسانی تمدن کیسب سے واضح مظہر انسان کی گفتگو ہے۔[5]

اس وقت یہ لوگ یاجوج ماجوج نامی خونخوار اور سخت دشمن سے بہت تنگ اور مصیبت میں تھے۔ ذوالقرنین کہ جو عظیم قدرتی وسائل کے حامل تھے، ان کے پاس پہنچے تو انہیں بڑی تسلی ہوئی۔ انہوں نے ان کا دامن پکڑ لیا اور'' کہنے لگے: اے ذوالقرنین یاجوج ماجوج اس سرزمین پر فساد کرتے ہیں۔ کیا ممکن ہے کہ خرچ آپ کو ہم دے دیں اور آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار بنا دیں''۔[6]

وہ ذوالقرنین کی زبان تو نہیں سمجھتے تھے اس لئے ہوسکتا ہے یہ بات انہوں نے اشارے سے کی ہو یا پھر ٹوٹی پھوٹی زبان میں اظہار مدعا کیا ہو۔[7]

بہرحال اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی اقتصادی حالت اچھی تھی لیکن سوچ بچار، منصوبہ بندی، اور صنعت کے لحاظ سے وہ کمزور تھے۔ لہٰذا وہ اس بات پر تیار تھے کہ اس اہم دیوار کے اخراجات اپنے ذمہ لے لیں، اس شرط کے ساتھ ذوالقرنین

---

[1] بعض مفسرین نے اس احتمال کو بھی بعید قرار نہیں دیا کہ ان کے پاس رہنے کو کوئی گھر بھی نہ تھے کہ وہ سورج کی تپش سے بچ سکتے۔ اس سلسلے میں ایک اور احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ وہ لوگ ایسے بیابان میں رہتے تھے کہ جس میں کوئی پہاڑ، درخت، پناہ گاہ اور کوئی ایسی چیز نہ تھی کہ وہ سورج کی تپش سے بچ سکتے گویا اس بیابان میں ان کے لئے کوئی سایہ نہ تھا۔

[2] سورہ کہف آیت 91

[3] سورہ کہف آیت 96

[4] سورہ کہف آیت 97

[5] سورہ کہف آیت 97

[6] سورہ کہف آیت 98

[7] سورہ کہف آیت 95

نے اس کی منصوبہ بندی اور تعمیر کی ذمہ داری قبول کر لیں۔

اس پر ذوالقرنین نے انہیں جواب دیا: ''یہ تم نے کیا کہا؟ اللہ نے مجھے جو کچھ دے رکھا ہے، وہ اس سے بہتر ہے کہ جو تم مجھے دینا چاہتے ہو''۔ [1]

اور میں تمہاری مالی امداد کا محتاج نہیں ہوں۔

''تم قوت و طاقت کے ذریعے میری مدد کرو تا کہ میں تمہارے اور ان دو مفسد قوموں کے درمیان مضبوط اور مستحکم دیوار بنا دوں''۔ [2]

پھر ذوالقرنین نے حکم دیا: ''لوہے کی بڑی بڑی سلیں میرے پاس لے آؤ''۔ [3]

جب لوہے کی سلیں آ گئیں تو انہیں ایک دوسرے پر چننے کا حکم دیا ''یہاں تک کہ دونوں پہاڑوں کے درمیان کی جگہ پوری طرح چھپ گئی''۔ [4]

تیسرا حکم ذوالقرنین نے یہ دیا کہ آگ لگانے کا مواد (ایندھن وغیرہ) لے آؤ اور اسے اس دیوار کے دونوں طرف رکھ دو اور اپنے پاس موجود وسائل سے آگ بھڑکاؤ اور اس میں دھونکو یہاں تک کہ لوہے کی سلیں انگاروں کی طرح سرخ ہو کر آخر پگھل جائیں۔ [5]

درحقیقت وہ اس طرح لوہے کے ٹکڑوں کو آپس میں جوڑ کر ایک کر دینا چاہتے تھے۔ یہی کام آج کل خاص مشینوں کے ذریعے انجام دیا جاتا ہے، لوہے کی سلوں کو اتنی حرارت دی گئی کہ وہ نرم ہو کر ایک دوسرے سے مل گئیں۔

پھر ذوالقرنین نے آخری حکم دیا: ''کہا کہ پگھلا ہوا تانبا لے آؤ تا کہ اسے اس دیوار کے اوپر ڈال دوں''۔ [6]

اس طرح اس لوہے کی دیوار پر تانبے کا لیپ کر کے اسے ہوا کے اثر سے اور خراب ہونے سے محفوظ کر دیا۔ بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ موجودہ سائنس کے مطابق اگر تانبے کی کچھ مقدار لوہے میں ملا دی جائے تو اس کی مضبوطی بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ ذوالقرنین چونکہ اس حقیقت سے آگاہ تھے اس لئے انہوں نے یہ کام کیا۔ آخر کار یہ دیوار اتنی مضبوط ہو گئی کہ اب وہ مفسد لوگ نہ اس کے اوپر چڑھ سکتے تھے اور نہ اس میں نقب لگا سکتے تھے۔ [7]

یہاں پر ذوالقرنین نے بہت اہم کام انجام دیا تھا۔ مستکبرین کی روش تو یہ ہے کہ ایسا کام کر کے وہ بہت فخر و ناز کرتے ہیں یا احسان جتلاتے ہیں لیکن ذوالقرنین چونکہ مرد خدا تھے۔

---

[1] سورہ کہف آیت 96

[2] سورہ کہف آیت 96

[3] سورہ کہف آیت 96

[4] سورہ کہف آیت 96

[5] سورہ کہف آیت 92

[6] سورہ کہف آیت 93

[7] بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہ مراد نہیں کہ وہ مشہور زبانوں میں سے کسی کو جانتے نہیں تھے بلکہ وہ بات کا مفہوم نہیں سمجھ سکتے تھے یعنی فکری لحاظ سے وہ بہت پسماندہ تھے۔

''لہٰذا انتہائی ادب کے ساتھ کہنے لگے: یہ میرے رب کی رحمت ہے''۔[1]

اگر میرے پاس ایسا اہم کام کرنے کے لئے علم و آگاہی ہے تو یہ خدا کی طرف سے ہے اور اگر مجھ میں کوئی طاقت ہے اور میں بات کرسکتا ہوں تو وہ بھی اس کی طرف سے ہے اور اگر یہ چیزیں اور ان کا ڈھالنا میرے اختیار میں ہے تو یہ بھی پروردگار کی وسیع رحمت کی برکت ہے میرے پاس کچھ بھی میری اپنی طرف سے نہیں ہے کہ جس پر میں فخر و ناز کروں اور میں نے کوئی خاص کام بھی نہیں کیا کہ اللہ کے بندوں پر احسان جتاتا پھروں۔ اس کے بعد مزید کہنے لگے: ''یہ نہ سمجھنا کہ یہ کوئی دائمی دیوار ہے'' جب میرے پروردگار کا حکم آ گیا تو یہ درہم برہم ہو جائے گی اور زمین بالکل ہموار ہو جائے گی، اور میرے رب کا وعدہ حق ہے''۔[2]

یہ کہہ کر ذوالقرنین نے اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ اختتام دنیا اور قیامت کے موقع پر یہ سب کچھ درہم برہم ہو جائے گا۔

ذوالقرنین کون تھے؟

جس ذوالقرنین کا قرآن مجید میں ذکر ہے، تاریخی طور پر وہ کون شخص ہے، تاریخ کی مشہور شخصیتوں میں سے یہ داستان کس پر منطبق ہوتی ہے، اس سلسلے میں مفسرین کے مابین اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں جو بہت سے نظریات پیش کیے گئے ہیں ان میں سے یہ تین زیادہ اہم ہیں۔[3]

جدید ترین نظریہ یہ ہے جو ہندوستان کے مشہور عالم ابوالکلام آزاد نے پیش کیا ہے۔ ابوالکلام آزاد کسی دور میں ہندوستان کے وزیر تعلیم تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک تحقیقی کتاب لکھی ہے۔ اس نظریہ کے مطابق ذوالقرنین، ''کورش کبیر'' ''بادشاہ کامنشی'' ہے۔[4]

لہٰذا وہ اسے اسکندر ذوالقرنین کے نام سے پکارتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس نے اپنے باپ کی موت کے بعد روم، مغرب اور مصر پر تسلط حاصل کیا۔ اس نے اسکندریہ شہر بنایا۔ پھر شام اور بیت المقدس پر اقتدار قائم کیا۔ وہاں سے ارمنستان گیا۔ عراق و ایران کو فتح کیا۔ پھر ہندوستان اور چین کا قصد کیا وہاں سے خراسان پلٹ آیا۔ اس نے بہت سے نئے شہروں کی بنیاد رکھی۔ پھر وہ عراق آ گیا۔ اس کے بعد وہ شہر ''زور'' میں بیمار پڑا اور مر گیا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کی عمر چھتیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس کا جسد خاکیسکندریہ لے جا کر دفن کر دیا گیا۔

دوسرا: مؤرخین میں سے بعض کا نظریہ ہے کہ ذوالقرنین یمن کا ایک بادشاہ تھا۔

اصمعی نے اپنی تاریخ ''عرب قبل از اسلام'' میں، ابن ہشام نے اپنی مشہور تاریخ ''سیرۃ'' میں اور ابوریحان بیرونی نے ''الآثار الباقیۃ'' میں یہی نظریہ پیش کیا ہے۔

یہاں تک کہ یمن کی ایک قوم ''حمیری'' کے شعراء اور زمانہ جاہلیت کے بعض شعراء کے کلام میں دیکھا جا سکتا ہے کہ انہوں

---

[1] سورہ کہف آیت 94

[2] یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ ان کے درمیان مترجمین کے ذریعے بات چیت ہوئی ہو یا پھر خدائی الہام کے ذریعے حضرت ذوالقرنین نے ان کی بات سمجھی ہو جیسے حضرت سلیمان بعض پرندوں سے بات کرلیا کرتے تھے۔

[3] پہلا: بعض کا خیال ہے کہ ''اسکندر مقدونی'' ہی ذوالقرنین ہے۔

[4] فارسی میں اس کتاب کے ترجمے کا نام ''ذوالقرنین یا کورش کبیر'' رکھا گیا ہے۔
اس سلسلے میں مزید آگاہی کیلئے رجوع کریں تفسیر نمونہ جلد 7 صفحہ 197

نے ذوالقرنین کے اپنے میں سے ہونے پر فخر کیا ہے۔

ذوالقرنین کو یہ نام کیوں دیا گیا؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ ''ذوالقرنین'' کا معنی ہے۔''دوسینگوں والا'' سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہیں اس نام سے کیوں موسوم کیا گیا۔بعض کا نظریہ ہے کہ یہ نام اس لئے پڑا کہ وہ دنیا کے مشرق ومغرب تک پہنچے کہ جسے عرب ''قرنی الشّمس'' (سورج کے دوسینگ) سے تعبیر کرتے ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ نام اس لئے ہوا کہ انہوں نے دوقرن زندگی گزاری یا حکومت کی۔اور پھر یہ کہ قرن کی مقدار کتنی ہے،اس میں بھی مختلف نظریات ہیں۔بعض کہتے ہیں کہ ان کے سر کے دونوں طرف ایک خاص قسم کا ابھار تھا اس وجہ سے ذوالقرنین مشہور ہو گئے۔آخر کار بعض کا نظریہ یہ ہے کہ ان کا خاص تاج دوشاخوں والا تھا۔

جناب ذوالقرنین کی ممتاز صفات

قرآن مجید سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین ممتاز صفات کے حامل تھے۔اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے اسباب ان کے اختیار میں دیئے تھے،انہوں نے تین اہم لشکر کشیاں کیں۔پہلے مغرب کی طرف،پھر مشرق کی طرف اور آخر میں ایک ایسے علاقے کی طرف کہ جہاں ایک کوہستانی درہ موجود تھا،ان مسافرت میں وہ مختلف اقوام سے ملے۔وہ ایک مرد مومن،موحد اور مہربان شخص تھے۔وہ عدل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے۔اسی بناء پر اللہ کا لطف خاص ان کے شامل حال تھا۔وہ نیکوں کے دوست او رظالموں کے دشمن تھے۔انہیں دنیا کے مال ودولت سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔وہ اللہ پر بھی ایمان رکھتے تھے اور روز جزاء پر بھی۔انہوں نے ایک نہایت مضبوط دیوار بنائی ہے،یہ دیوار انہوں نے اینٹ اور پتھر کے بجائے لوہے اور تانبے سے بنائی (اور اگر دوسرے مصالحے بھی اس میں ستعمال ہوئے ہوں تو ان کی بنیادی حیثیت نہ تھی)۔اس دیوار بنانے سے ان کا مقصد مستضعف اور ستم دیدہ لوگوں کی یاجوج وماجوج کے ظلم وستم کے مقابلے میں مدد کرنا تھا۔

وہ ایسے شخص تھے کہ نزول قرآن سے قبل ان کا نام لوگوں میں مشہور تھا۔لہٰذا قریش اور یہودیوں نے ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا تھا،جیسا کہ قرآن کہتا ہے:''تجھ سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں:'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے بہت سی ایسی روایات منقول ہیں جن میں ہے کہ:''وہ نبی نہ تھے بلکہ اللہ کے ایک صالح بندے تھے''۔

دیوار ذوالقرنین کہاں ہے؟

بعض لوگ چاہتے ہیں کہ اسے مشہور دیوار چین پر منطبق کریں کہ جو اس وقت موجود ہے اور کئی سو کلومیٹر لمبی ہے لیکن واضح ہے کہ دیوار چین لوہے اور تانبے سے نہیں بنی ہے اور نہ وہ کسی چھوٹے کوہستانی درے میں ہے،وہ ایک عام مصالحے سے بنی ہوئی دیوار ہے،اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے کئی سو کلومیٹر لمبی ہے اور اب بھی موجود ہے۔بعض کا اصرار ہے کہ یہ وہی دیوار ''مارب'' ہے کہ جو یمن میں ہے،یہ ٹھیک ہے کہ دیوار مارب ایک کوہستانی درے میں بنائی گئی ہے لیکن وہ سیلاب کو روکنے کے لئے اور پانی ذخیرہ کرنے کے مقصد سے بنائی گئی ہے اور ویسے بھی وہ لوہے اور تانبے سے بنی ہوئی نہیں ہے۔

جب کہ علماء ومحققین کی گواہی کے مطابق سرزمین ''قفقاز'' میں دریائے خزر اور دریائے سیاہ کے درمیان پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے کہ جو ایک دیوار کی طرح شمال اور جنوب کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے اس میں ایک دیوار کی طرح کا درہ موجود ہے جو

مشہور درہ ''داریال'' ہے، یہاں اب تک ایک قدیم تاریخی لوہے کی دیوار نظر آتی ہے، اسی بناء پر بہت سے لوگوں کا نظریہ ہے کہ دیوار ذوالقرنین یہی ہے۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ وہیں قریب ہی ''سائرس'' نامی ایک نہر موجود ہے اور ''سائرس'' کا معنی ''کورش'' ہی ہے (کیونکہ یونانی ''کورش'' کو ''سائرس'' کہتے تھے)۔ ارمنی کے قدیم آثار میں اس دیوار کو ''بھاگ گورائی'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے، اس لفظ کا معنی ہے ''درہ کورش'' یا ''معبر کورش'' (کورش کے عبور کرنے کی جگہ) ہے یہ سند نشاندہی کرتی ہے کہ اس دیوار کا بانی ''کورش'' ہی تھا۔

یاجوج ماجوج[1] کون تھے؟

قرآن واضح طور پر گواہی دیتا ہے کہ یہ دو وحشی خونخوار قبیلوں کے نام تھے، وہ لوگ اپنے اردگرد رہنے والوں پر بہت زیادتیاں اور ظلم کرتے تھے۔ عظیم مفسر علامہ طباطبائی نے المیزان میں لکھا ہے کہ توریت کی ساری باتوں سے مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ماجوج یا یاجوج وماجوج ایک یا کئی ایک بڑے بڑے قبیلے تھے، یہ شمالی ایشیا کے دور دراز علاقے میں رہتے تھے، یہ جنگجو، غارت گر اور ڈاکو قسم کے لوگ تھے۔

تاریخ کے بہت سے دلائل کے مطابق زمین کے شمال مشرق ''مغولستان'' کے اطراف میں گزشتہ زمانوں میں انسانوں کا گویا جوش مارتا ہوا چشمہ تھا، یہاں کے لوگوں کی آبادی بڑی تیزی سے پھلتی اور پھولتی تھی، آبادی زیادہ ہونے پر یہ لوگ مزرق کی سمت یا نیچے جنوب کی طرف چلے جاتے تھے اور سیل رواں کی طرح ان علاقوں میں پھیل جاتے تھے اور پھر تدریجاً وہاں سکونت اختیار کر لیتے تھے، تاریخ کے مطابق سیلاب کی مانند ان قوموں کے اٹھنے کے مختلف دور گزرے ہیں۔[2]

کورش کے زمانے میں بھی ان کی طرف ایک حملہ ہوا، یہ تقریباً پانچ سو سال قبل مسیح کی بات ہے لیکن اس زمانے میں ''ماد'' اور ''فارس'' کی متحدہ حکومت معرض وجود میں آچکی تھی لہٰذا حالات بدل گئے اور مغربی ایشیا ان قبائل کے حملوں سے آسودہ خاطر ہو گیا۔ لہٰذا یہ زیادہ صحیح لگتا ہے کہ یاجوج اور ماجوج انہی وحشی قبائل میں سے تھے، جب کورش ان علاقوں کی طرف گئے تو قفقاز کے لوگوں نے درخواست کی کہ انہیں ان قبائل کے حملوں سے بچایا جائے، لہٰذا اس نے وہ مشہور دیوار تعمیر کی ہے جسے دیوار ذوالقرنین کہتے ہیں۔

قوم تُبّع

سرزمین یمن جزیرۃ العرب میں واقع ہے اور اس کا شمار دنیا کی ایسی آباد اور بابرکت زمینوں میں ہوتا ہے، جو ماضی میں درخشندہ تمدن کی حامل تھی، اس سرزمین پر ایسے بادشاہ حکومت کیا کرتے تھے جن کا نام ''تُبّع'' (جس کی جمع ''تبایعہ'' ہے) تھا چونکہ لوگ ان کی ''اتباع'' کیا کرتے تھے، اس لئے ان کو ''تُبّع'' کہتے تھے یا پھر اس لئے کہ وہ کئی پشتوں تک یکے بعد دیگرے برسر اقتدار آتے رہے۔

قوم تُبّع کون تھی؟

قرآن مجید میں صرف دو مقام پر ''تُبّع'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، ایک تو سورہ دخان آیت 37 میں اور دوسرے سورہ ''ق'' کی

---

[1] قرآن مجید کی دو سورتوں میں یاجوج ماجوج کا ذکر آیا ہے ایک سورہ کہف آیت 94 میں اور دوسرا سورہ انبیاء کی آیت 96 میں۔

[2] ان میں ایک حملہ ان وحشی قبائل نے چوتھی صدی عیسوی میں ''اتیلا'' کی کمان میں کیا، اس حملے میں روم کا شاہی تمدن خاک میں مل گیا۔ ایک اور دور کہ جو ان کے حملوں کا تقریباً آخری دور شمار ہوتا ہے، وہ بارہویں صدی ہجری میں چنگیز خاں کی سرپرستی میں ہوا، انھوں نے مسلمان اور عرب ممالک پر حملہ کیا، اس حملے میں بغداد سمیت بہت سے شہر تباہ برباد ہو گئے۔

14ویں آیت میں جہاں پر ارشاد ہوتا ہے:

''گھنے درختوں کی سرزمین والی قوم شعیب اور قوم تبع، ایک نے خدا کے رسولوں کو جھٹلایا تو خدا کی تہدید بھی ان کے بارے میں سچ ثابت ہوگئی''۔

''تبع''، یمن کے بادشاہوں کا ایک عمومی لقب تھا، جس طرح ایران کے بادشاہوں کو کسریٰ، ترک سلاطین کو خاقان، مصر کے بادشاہوں کو فرعون اور روم کے شہنشاہوں کو قیصر کہا جاتا تھا۔

یمن کے بادشاہوں کو ''تبع'' یا تو اس لئے کہا جاتا تھا کہ یہ لوگوں کو اپنی پیروی کی دعوت دیا کرتے تھے، یا پھر اس کے لئے کہ وہ یکے بعد دیگرے براہ مملکت ہوا کرتے تھے۔

بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے یمن کے تمام بادشاہوں کی بات نہیں کی، بلکہ کسی خاص بادشاہ کا ذکر کیا ہے (جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معاصر خاص فرعون کی بات کی ہے)۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ اس کا نام ''اسعد ابوکرب'' تھا۔

بعض مفسرین کا یہ نظریہ ہے کہ وہ بذات خود حق طلب اور صاحب ایمان شخص تھا، انھوں نے قرآن مجید کی دونوں آیات سے استدلال کیا ہے، کیونکہ قرآن پاک کی مذکورہ دونوں آیات میں اس کی ذات کی مذمت نہیں کی گئی بلکہ اس کی قوم کی مذمت کی گئی ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی جانے والی روایت بھی اسی بات کی شاہد ہے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ''تبع'' کو برا مت کہو کیونکہ وہ ایمان لا چکا تھا''

تُبّع مدینہ کے نزدیک

ایک اور روایت میں ہے کہ جب ''تبع'' اپنے کشور کشائی کے ایک سفر میں مدینہ کے قریب پہنچا تو وہاں کے ساکن یہودی علماء کو پیغام بھیجا کہ اس سرزمین کو ویران کرنا چاہتا ہوں تا کہ کوئی بھی یہودی اس جگہ نہ رہنے پائے، اور عرب قانون حکم فرما ہو۔

یہودیوں کا سب سے بڑا عالم ''شامول'' تھا، اس نے کہا: یہ وہ شہر ہے جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے پیدا ہونے والے ایک پیغمبر کی ہجرت گاہ بنے گا، پھر اس نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چند صفات گنوائیں، تبع جس کے ذہن میں گویا اس بارے میں کچھ معلومات تھیں اس نے کہا: ''تو پھر اس شہر کو ویران نہیں کروں گا''۔

حتیٰ کہ ایک اور روایت میں اسی داستان کے ذیل میں یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ اس نے ''اوس'' اور ''خزرج'' کے بعض قبائل کو جو اس کے ہمراہ تھے حکم دیا کہ وہ اسی شہر میں رہ جائیں اور جب پیغمبر موعود ظہور کریں تو وہ ان کی امداد کریں اور اپنی اولاد کو بھی وہ اسی بات کی وصیت کرتا رہا، حتیٰ کہ اس نے ایک خط بھی تحریر کر کے اس کے سپرد کر دیا، جس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کا اظہار کیا گیا تھا۔

تُبّع شہر مکہ میں

صاحب ''اعلام القرآن''، رقمطراز ہیں:

''تبع''، یمن کے عالمگیر بادشاہوں میں سے ایک تھا کہ جس نے ہندوستان تک فوج کشی کی اور اس علاقے کی تمام حکومتوں کو اپنی زیر نگرانی کر لیا، اپنی فوج کشی کی ایک مہم کے دوران میں وہ مکہ معظّمہ پہنچا اور اس نے خانہ کعبہ کے منہدم کرنے کا ارادہ کر لیا، لیکن وہ

ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہوگیا کہ طبیب اس کے معالجے سے عاجز آ گئے۔

اس کے ہمرکابوں میں کچھ اہل علم بھی موجود تھے جس کا سرپرست ''شامول'' نامی ایک حکیم تھا، اس نے کہا: آپ کی بیماری کا اصل سبب خانہ کعبہ کے بارے میں بُری نیت ہے۔

''تبع'' اپنے مقصد سے باز آ گیا اور نذر مانی کہ وہ خانہ کعبہ کا احترام کرے گا اور صحت یاب ہونے کے بعد خانہ کعبہ پر یمانی چادر کا غلاف چڑھائے گا۔

دوسری تاریخوں میں بھی خانہ کعبہ پر غلاف چڑھانے کی داستان منقول ہے جو تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہے یہ فوج کشی اور کعبہ پر غلاف چڑھانے کا مسئلہ 5 عیسوی میں وقوع پذیر ہوا، اب بھی شہر مکہ میں ایک جگہ موجود ہے جس کا نام ''دارالتبابعۃ'' ہے۔

بہرحال یمن کے بادشاہوں (تبابعہ یمن) کی داستان کا ایک بہت بڑا حصہ تاریخی لحاظ سے ابہام سے خالی نہیں ہے، کیونکہ ان کی تعداد اور ان کی حکومت کے عرصہ کے بارے میں زیادہ معلومات مہیا نہیں ہیں، اس بارے میں بعض متضاد روایتیں بھی ملتی ہیں، جو کچھ اسلامی روایات میں ہے وہ تفسیری مواد ہو یا تاریخی اور حدیثی، صرف بادشاہ کے بارے میں ہے، جس کا قرآن میں دو مرتبہ ذکر ہوا ہے۔

انطاکیہ کے رسول

''انطاکیہ'' شام کے علاقہ کا ایک قدیم شہر ہے بعض کے قول کے مطابق یہ شہر مسیح علیہ السلام سے تین سو سال پہلے تعمیر ہوا، یہ شہر قدیم زمانے میں دولت وثروت اور علم وتجارت کے لحاظ سے مملکت روم کے تین بڑے شہروں میں سے ایک شمار ہوتا تھا۔

شہر انطاکیہ، حلب سے ایک سو کلومیٹر سے کچھ کم اور اسکندریہ سے تقریباً ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

یہ خلیفہ ثانی کے زمانہ میں ''ابوعبیدہ جراح'' کے ہاتھوں فتح ہوا اور رومیوں کے ہاتھوں سے نکل گیا اس میں رہنے والے لوگ عیسائی تھے انھوں نے جزیہ دینا قبول کرلیا اور اپنے مذہب پر باقی رہ گئے۔

پہلی عالمی جنگ کے بعد یہ شہر ''فرانسیسیوں'' نے اسے چھوڑنے کا فیصلہ کیا تو اس بات کے پیش نظر کہ ان کے شام سے نکلنے کے بعد اس ملک میں ہونے والے فتنہ وفساد سے عیسائیوں کو کوئی گزند نہ پہنچے، انھوں نے اسے ترکی کے حوالے کر دیا۔

انطاکیہ عیسائیوں کی نگاہ میں اسی طرح دوسرا مذہبی شہر شمار ہوتا ہے جس طرح مسلمانوں کی نظر میں مدینہ ہے اور ان کا پہلا شہر بیت المقدس ہے جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی دعوت کی ابتداء کی اور اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں میں سے ایک گروہ نے انطاکیہ کی طرف ہجرت کی اور ''پولس'' اور ''برنابا'' شہروں کی طرف گئے، انھوں نے لوگوں کو اس دین کی طرف دعوت دی، یہاں سے دین عیسوی نے وسعت حاصل کی، اسی بناء پر قرآن میں اس شہر کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ گفتگو ہوئی ہے۔

قرآن اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''تم ان سے بستی والوں کی مثال بیان کرو کہ جس وقت خدا کے رسول ان کی طرف آئے۔''[1]

قرآن اس اجمالی بیان کے بعد ان کے قصے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ''وہ وقت کہ جب ہم نے دو رسولوں کو ان کی طرف بھیجا لیکن انھوں نے ہمارے رسولوں کی تکذیب کی، لہٰذا ہم نے ان دو کی تقویت کے لئے تیسرا رسول بھیجا، ان تینوں نے

---

[1] سورہ یٰسین آیت 13

کہا کہ ہم تمہاری طرف خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں''۔[1]

اس بارے میں کہ یہ رسول کون تھے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بعض نے کہا ہے کہ ان دو کے نام ''شمعون'' اور ''یوحنا'' تھے اور تیسرے کا نام ''پولس'' تھا اور بعض نے ان کے دوسرے نام ذکر کئے ہیں۔

اس بارے میں بھی مفسرین میں اختلاف ہے کہ وہ خدا کے پیغمبر اور رسول تھے یا حضرت مسیح علیہ السلام کے بھیجے ہوئے اور ان کے نمائندے تھے (اور اگر خدا یہ فرماتا ہے کہ ہم نے انہیں بھیجا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام کے بھیجے ہوئے بھی خدا ہی کے رسول ہیں)۔ یہ اختلافی مسئلہ ہے اگر چہ قرآن ظاہر پہلی تفسیر کے موافق ہے اگر چہ اس نتیجہ میں کہ جو قرآن لینا چاہتا ہے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس گمراہ قوم نے ان رسولوں کی دعوت پر کیا ردعمل ظاہر کیا؟ قرآن کہتا ہے: انھوں نے بھی وہی بہانہ کیا کہ جو بہت سے سرکش کافروں نے گزشتہ خدائی پیغمبروں کے جواب میں کیا تھا: ''انھوں نے کہا، تم تو ہم ہی جیسے بشر ہو اور خدائے رحمٰن نے کوئی چیز نازل نہیں کی ہے، تمہارے پاس جھوٹ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔''[2]

اگر خدا کی طرف سے کوئی بھیجا ہوا ہی آنا تھا تو کوئی مقرب فرشتہ ہونا چاہئے تھا، نہ کہ ہم جیسا انسان اور اسی امر کو انھوں نے رسولوں کی تکذیب اور فرمان الٰہی کے نزول کے انکار کی دلیل خیال کیا۔

حالانکہ وہ خود بھی جانتے تھے کہ پوری تاریخ میں سب رسول نسل آدم علیہ السلام ہی سے ہوئے ہیں ان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی تھے کہ جن کی رسالت سب مانتے تھے، یقیناً وہ انسان ہی تھے اس سے قطع نظر کیا انسانوں کی ضروریات، مشکلات اور تکلیفیں انسان کے علاوہ کوئی اور سمجھ سکتا ہے۔؟[3]

بہر حال یہی پیغمبر اس گمراہ قوم کی شدید اور سخت مخالفت کے باوجود مایوس نہ ہوئے اور انھوں نے کمزوری نہ دکھائی اور ان کے جواب میں ''کہا: ہمارا پروردگار جانتا ہے کہ یقیناً ہم تمہاری طرف اس کے بھیجے ہوئے ہیں۔''

''اور ہمارے ذمہ تو واضح اور آشکار طور پر ابلاغ رسالت کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔''(وما علینا الا البلاغ المبین)

مسلمہ طور پر انھوں نے صرف دعویٰ ہی نہیں کیا اور قسم پر ہی قناعت نہیں کی، بلکہ ''بلاغ مبین'' ان کا ابلاغ ''بلاغ مبین'' کا مصداق نہ ہونا کیونکہ ''بلاغ مبین'' تو اس طرح ہونا چاہئے کہ حقیقت سب تک پہنچ جائے اور بات یقینی اور محکم دلائل اور واضح معجزات کے سوا ممکن نہیں ہے۔ بعض روایات میں بھی آیا ہے کہ انھوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی طرح بعض ناقابل علاج بیماروں کو حکم خدا سے شفا بخشی۔

ہم آپ کو سنگسار کر دیں گے

لیکن یہ دل کے اندھے واضح منطق اور معجزات کے سامنے نہ صرف جھکے نہیں بلکہ انھوں نے اپنی خشونت اور سختی میں اضافہ

---

[1] سورہ یٰسین آیت 14

[2] سورہ یٰسین آیت 15

[3] یہاں پر خدا کی صفت رحمانیت کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟ ممکن ہے کہ یہ اس لحاظ سے ہو کہ خدا ان کی بات کو نقل کرتے ہوئے خصوصیت سے اس صفت کا ذکر کرتا ہے تا کہ ان کا جواب خود ان کی بات ہی سے حل ہو جائے، کیونکہ یہ بات کیسے ممکن ہو سکتی ہے کہ وہ خدا کہ جس کی رحمت عامہ نے سارے عالم کو گھیر رکھا ہے وہ انسانوں کی تربیت اور رشد و تکامل کی طرف دعوت دینے کے لئے پیغمبر نہ بھیجے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ انھوں نے خصوصیت کے ساتھ وصف رحمن کا اس لئے ذکر کیا ہے کہ وہ یہ کہیں کہ خداوند مہربان اپنے بندوں کا کام پیغمبروں کے بھیجنے اور مشکل ذمہ داریاں عائد کرنے سے نہیں کرتا وہ تو آزاد رکھتا ہے، یہ کمزور اور بے بنیاد منطق اس گروہ کے انکار کے ساتھ ہم آہنگ تھی۔

کر دیا اور تکذیب کے مرحلے سے قدم آگے بڑھاتے ہوئے تہدید اور شدت کے مرحلے میں داخل ہو گئے ''انھوں نے کہا: ہم تو تمہیں فال بد سمجھتے ہیں تمہارا وجود منحوس ہے اور تم ہمارے شہر کے بدبختی کا سبب ہو۔''[1]

ممکن ہے کہ ان انبیاء الٰہی کے آنے کے ساتھ ہی اس شہر کے لوگوں کی زندگی میں ان کے گناہوں کے زیر اثر یا خدائی تنبیہ کے طور پر بعض مشکلات پیش آئی ہوں، جیسا کہ بعض مفسرین نے نقل بھی کیا ہے کہ ایک مدت تک بارش کا نزول منقطع رہا، لیکن انھوں نے نہ صرف یہ کہ کوئی عبرت حاصل نہیں کی بلکہ اس امر کو پیغمبروں کی دعوت کے ساتھ وابستہ کر دیا۔

پھر اس پر بس نہیں کی بلکہ کھلی دھمکیوں کے ساتھ اپنی قبیح نیتوں کو ظاہر کیا اور کہا: ''اگر تم ان باتوں سے دستبردار نہ ہوئے تو ہم یقینی طور پر سنگسار کر دیں گے اور ہماری طرف سے تمہیں دردناک سزا ملے گی''۔[2] یہ وہ مقام تھا کہ خدا کے پیغمبر اپنی منہ بولتی منطق کے ساتھ ان کی فضول ہذیانی باتوں کا جواب دینے کے لئے تیار ہو گئے اور ''انھوں نے کہا: تمہاری بدبختی اور نحوست خود تمہاری ہی طرف سے ہے اور اگر تم ٹھیک طرح سے غور کرو تو اس حقیقت سے واقف ہو جاؤ گے''۔[3]

اگر بدبختی اور منحوس حوادث تمہارے معاشرے کو گھیرے ہوئے ہیں اور برکات الٰہیہ تمہارے درمیان میں سے اٹھ گئی ہیں تو اس کا عامل اپنے اندر اپنے پست افکار اور قبیح اعمال میں تلاش کرو نہ کہ ہماری دعوت میں، یہ تمہی ہو کہ جنھوں نے بت پرستی، خود غرضی، ظلم اور شہوت پرستی سے اپنے زندگی کی فضا کو تاریک بنا ڈالا ہے اور خدا کی برکات کو اپنے سے منقطع کر کے رکھ دیا ہے''۔

تمہاری اصلی بیماری وہی تمہارا حد سے تجاوز ہے اگر تم توحید کا انکار کرتے ہوئے شرک کی طرف رخ کرتے ہو تو اس کی وجہ حق سے تجاوز ہے اور اگر تمہارا معاشرہ بُرے انجام میں گرفتار ہوا ہے تو اس کا سبب بھی گناہ میں زیادتی اور شہوات میں آلودگی ہے خلاصہ یہ کہ اگر خیر خواہوں کی خیر خواہی کے جواب میں تم انہیں موت کی دھمکی دیتے ہو تو یہ بھی تمہارے تجاوز کی بنا پر ہے۔

ایک جاں بکف مجاہد

قرآن میں ان رسولوں کی جدوجہد کا ایک اور حصہ بیان کیا گیا ہے اس حصے میں بتایا گیا ہے کہ ان میں سے تھوڑے سے مومنین نے بڑی شجاعت سے ان انبیاء کی حمایت کی اور وہ کافر و مشرک اور ہٹ دھرم اکثریت کے مقابلے میں کھڑے ہوئے اور جب تک جان باقی رہی انبیاء الٰہی کا ساتھ دیتے رہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ''ایک (باایمان) مرد شہر کے دور دراز مقام سے بڑی تیزی کے ساتھ بھاگتا ہوا کافر گروہ کے پاس آیا اور کہا: اے میری قوم مرسلین خدا کی پیروی کرو۔''[4]

اس شخص کا نام اکثر مفسرین نے ''حبیب نجار'' بیان کیا ہے وہ ایسا شخص تھا کہ جو پروردگار کے پیغمبروں کی پہلی ہی ملاقات میں ان کی دعوت کی حقانیت اور ان کی تعلیمات کی گہرائی کو پا گیا تھا وہ ایک ثابت قدم اور مصمم کار مومن ثابت ہوا جس وقت اسے خبر ملی کہ وسط شہر میں لوگ ان انبیاء الٰہی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور شاید انہیں شہید کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس نے خاموش رہنے کو جائز نہ سمجھا چنانچہ

---

[1] سورہ یٰسین آیت 18
[2] سورہ یٰسین آیت 18
[3] سورہ یٰسین آیت 18
[4] سورہ یٰسین آیت 20

"یسعی" کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑی تیزی اور جلدی کے ساتھ مرکز شہر تک پہنچا اور جو کچھ اس کے بس میں تھا حق کی حمایت اور دفاع میں فروگزاشت نہ کی۔

"رجل" کی تعبیر ناشناختہ شکل میں شاید اس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ایک عام آدمی تھا، کوئی قدرت وشوکت نہیں رکھتا تھا اور اپنی راہ میں یک وتنہا تھا لیکن اس کے باوجود ایمان کے نور وحرارت نے اس کا دل اس طرح سے روشن اور مستعد کر رکھا تھا کہ راہ توحید کے مخالفین کی سخت مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے میدان میں کود پڑا۔

"اقصی المدینة" کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ان رسولوں کی دعوت شہر کے دور دراز کے مقامات تک پہنچ گئی تھی اور امادہ دلوں میں اثر کر چکی تھی، اس سے قطع نظر کہ شہر کے دور دراز کے علاقے ہمیشہ ایسے مستضعفین کے مرکز ہوتے ہیں کہ جو حق کو قبول کرنے کے لئے زیادہ وتیار ہوتے ہیں، اس کے برعکس شہروں میں نسبتاً خوشحال لوگ زندگی بسر کرتے ہیں جن کو حق کی طرف راغب کرنا اسانی کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ یہ مومن مجاہد اپنے شہر والوں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے کس منطق اور دلیل کو اختیار کرتا ہے۔ اس نے پہلے یہ دلیل اختیار کی کہ "ایسے لوگوں کی پیروی کرو جو تم سے اپنی دعوت کے بدلے میں کوئی اجر طلب نہیں کرتے"۔ [1]

یہ ان کی صداقت کی پہلی نشانی ہے کہ ان کی دعوت میں کسی قسم کی مادی منفعت نہیں ہے، وہ تم سے نہ کوئی مال چاہتے ہیں اور نہ ہی جاہ ومقام، یہاں تک کہ وہ تو تشکر وسپاس گزاری بھی نہیں چاہتے اور نہ ہی کوئی اور صلہ۔ اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: (علاوہ ازیں) یہ رسول جیسا ان کی دعوت کے مطالب اور ان کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے "کہ وہ ہدایت یافتہ افراد ہیں"۔ [2]

یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ کسی کی دعوت کو قبول نہ کرنا یا تو اس بنا پر ہوتا ہے کہ اس کی دعوت حق نہیں ہے اور وہ بے راہ روی اور گمراہی کی طرف کھینچ رہا ہے یا یہ کہ ہے تو حق لیکن اس کو پیش کرنے والے اس کے ذریعے کوئی خاص مفاد حاصل کر رہے ہیں کیونکہ یہ بات خود اس قسم کی دعوت کے بارے میں بدگمانی کا ایک سبب ہے، لیکن جب نہ وہ بات ہو اور نہ یہ، تو پھر تامل وتردد کے کیا معنی؟

اس کے بعد قرآن ایک اور دلیل پیش کرتا ہے اور اصل توحید کے بارے میں بات کرتا ہے کیونکہ یہی انبیاء کی دعوت کا اہم ترین نکتہ ہے، کہتا ہے: "میں اس ہستی کی پرستش کیوں نہ کروں کہ جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔" [3]

وہ ہستی پرستش کے لائق ہے کہ جو خالق و مالک ہے اور نعمات بخشنے والی ہے، نہ کہ یہ بت کہ جن سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا، فطرت سلیم کہتی ہے کہ خالق کی عبادت کرنا چاہئے نہ کہ اس بے قدر وقیمت مخلوق کی۔

اس کے بعد خبردار کرتا ہے کہ یاد رکھو "تم سب کے سب آخر کار اکیلے ہی اس کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔" [4]

اپنے تیسرے استدلال میں بتوں کی کیفیت بیان کرتا ہے اور خدا کے لئے عبودیت کے اثبات کو، بتوں کی عبدیت کی نفی کے ذریعے تکمیل کرتے ہوئے کہتا ہے: "کیا میں خدا کے سوا اور معبود اپنالوں، جب کہ خدائے رحمٰن مجھے نقصان پہنچانا چاہے تو ان کی

---

[1] سورہ یٰسین آیت 21
[2] سورہ یٰسین آیت 22
[3] سورہ یٰسین آیت 22
[4] سورہ یٰسین آیت 22

شفاعت مجھے معمولی سا فائدہ بھی نہ دے گی اور وہ مجھے اس کے عذاب سے نہ بچا سکیں گے۔''[1]

اس کے بعد یہ مجاہد مومن مزید تاکید و توضیح کے لئے کہتا ہے: ''اگر میں اس قسم کے بتوں کی پرستش کروں اور انھیں پروردگار کا شریک قرار دوں تو میں کھلی ہوئی گمراہی میں ہوں گا۔''[2]

اس سے بڑھ کر کھلی گمراہی کیا ہوگی کہ عاقل و باشعور انسان ان بے شعور موجودات کے سامنے گھٹنے ٹیک دے اور انہیں زمین و آسمان کے خالق کے برابر جانے۔

اس مجاہد مومن نے ان استدلالات اور مؤثر و وسیع تبلیغات کے بعد ایک پر اثر تاثیر آواز کے ساتھ سب لوگوں کے درمیان اعلان کیا: میں تمہارے پروردگار پر ایمان لے آیا ہوں اور ان رسولوں کی دعوت کو قبول کیا ہے۔''اس بناء پر میری باتوں کو سنو۔''[3]

اور جان لو کہ میں ان رسولوں کی دعوت پر ایمان رکھتا ہوں اور تم میری بات پر عمل کرو کہ یہی تمہارے فائدہ کی بات ہے۔

اس مرد مومن کے مقابلہ میں قوم کا ردّ عمل

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ اس پاکباز مومن کے جواب میں اس ہٹ دھرم قوم کا ردعمل کیا تھا، قرآن نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کہی لیکن قرآن کے بعد کے لب ولہجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے شہید کر دیا۔

ہاں اس کی پر جوش اور ولولہ انگیز گفتگو قوی اور طاقتور استدلالات اور ایسے عمدہ و دلنشین نکات کے ساتھ تھی، مگر اس سے نہ صرف یہ کہ ان سیاہ دلوں اور مکر و غرور سے بھرے ہوئے سروں پر کوئی مثبت اثر نہیں ہوا بلکہ کینہ و عداوت کی آگ ان کے دلوں میں ایسے بھڑکی کہ وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے اور انتہائی سنگدلی اور بے رحمی سے اس شجاع مرد مومن کی جان کے پیچھے پڑ گئے، ایک روایت کے مطابق انھوں نے اسے پتھر مارنے شروع کئے اور اس کے جسم کو اس طرح سے پتھروں کا نشانہ بنایا کہ وہ زمین پر گر پڑا اور جان جان افرین کے سپرد کر دی، اس کے لبوں پر مسلسل یہ بات تھی کہ ''خداوندا میری اس قوم کو ہدایت فرما کہ وہ جانتے نہیں ہیں''۔

ایک اور روایت کے مطابق اسے اس طرح پاوں کے نیچے روندا کہ اس کی روح پرواز کر گئی۔

لیکن قرآن اس حقیقت کو ایک عمدہ اور سربستہ جملہ کے ساتھ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ''اسے کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جا''۔[4]

یہ وہی تعبیر ہے کہ جو راہ خدا کے شہیدوں کے بارے میں قرآن کی دو و سری آیات میں بیان ہوئی ہے: ''یہ گمان نہ کرو کہ جو لوگ راہ خدا میں قتل کئے گئے ہیں وہ مردہ ہیں بلکہ وہ تو زندہ جاوید ہیں اور اپنے پروردگار سے رزق پاتے ہیں۔''[5]

جاذب توجہ بات یہ ہے کہ یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ مرد مومن شہادت پاتے ہی جنت میں داخل ہو گیا، ان دونوں کے درمیان اس قدر کم فاصلہ تھا کہ قرآن مجید نے اپنی لطیف تعبیر میں اس کی شہادت کا ذکر کرنے کے بجائے اس کے بہشت میں داخل ہونے کو بیان کیا، شہیدوں کی منزل یعنی بہشت و سعادت کس قدر نزدیک ہے۔

---

[1] سورہ یٰسین آیت 23

[2] سورہ یٰسین آیت 24

[3] سورہ یٰسین آیت 25

[4] سورہ یٰسین آیت 26

[5] سورہ آل عمران آیت 169

بہر حال اس شخص کی پاک روح آسمانوں کی طرف، رحمت الٰہی کے قرب اور بہشت نعیم کی طرف پرواز کر گئی اور وہاں اسے صرف یہ آرزو تھی کہ: ''اے کاش میری قوم جان لیتی۔ اے کاش! وہ جان لیتے کہ میرے پروردگار نے مجھے اپنی بخشش اور عفو سے نوازا ہے اور مجھے مکرم لوگوں کی صف میں جگہ دی ہے۔''[1]

ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اس باایمان شخص نے اپنی زندگی میں بھی اپنی قوم کی خیر خواہی کی اور موت کے بعد بھی اس کی ہدایت کی ارزو رکھتا تھا۔''

بہر حال یہ تو اس مومن اور سچے مجاہد کا انجام تھا کہ جس نے اپنی ذمہ داری کی انجام دہی اور خدا کے پیغمبروں کی حمایت میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور آخر کار شربت شہادت نوش کیا اور جوار رحمت میں جگہ پائی۔

تین پیغمبروں علیہم السلام کا انجام کار

اگر چہ قرآن میں ان تین پیغمبروں کے انجام کار کے متعلق کوئی بات نہیں کی گئی کہ جو اقوام کی طرف مبعوث ہوئے۔ لیکن بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس قوم نے، اس مرد مومن کو شہید کرنے کے علاوہ اپنے پیغمبروں کو بھی شہید کر دیا جب کہ بعض نے تصریح کی ہے کہ اس مرد مومن نے لوگوں کو اپنے ساتھ مشغول رکھا تا کہ وہ پیغمبر اس سازش سے بچ جائیں، کہ جو ان کے خلاف کی گئی تھی، اور کسی پر امن جگہ منتقل ہو جائیں۔

اس ظالم اور سرکش قوم کا سرانجام

ہم نے دیکھا کہ شہر انطاکیہ کے لوگوں نے خدا کے پیغمبروں کی کیسے مخالفت کی، اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کا انجام کیا ہوا۔

قرآن اس بارے میں کہتا ہے: ''ہم نے اس کے بعد اس کی قوم پر کوئی لشکر آسمان سے نہیں بھیجا اور اصولاً ہمارا یہ طریقہ ہی نہیں ہے کہ ایسی سرکش اقوام کو نابود کرنے کے لئے ان امور سے کام لیں۔''[2]

ہم ان امور کے محتاج نہیں ہیں صرف ایک اشارہ ہی کافی ہے کہ جس سے ہم ان سب کو خاموش کر دیں اور انہیں دیار عدم کی طرف بھیج دیں اور ان کی زندگی کو درہم برہم کر دیں۔

صرف ایک اشارہ ہی کافی ہے کہ ان کے حیات کے عوامل ہی ان کی موت کے عامل میں بدل جائیں اور مختصر سے وقت میں ان کی زندگی کا دفتر لپیٹ کر رکھ دیں۔ پھر قرآن مزید کہتا ہے: ''صرف ایک آسمانی چیخ پیدا ہوئی، ایسی چیخ کہ جو ہلا دینے والی اور موت کا پیغام تھی اچانک سب پر موت کی خاموشی طاری ہو گئی''۔[3]

کیا یہ چیخ بجلی کی کڑک تھی کہ جو بادل سے اٹھی اور زمین پر جا پڑی اور ہر چیز کو لرزہ براندام کر دیا اور تمام عمارتوں کو تباہ کر دیا اور وہ سب خوف کی شدت سے موت کی آغوش میں چلے گئے؟

یا یہ ایسی چیخ تھی کہ جو زمین کے اندر سے ایک شدید زلزلے کی صورت میں اٹھی اور فضا میں دھماکہ ہوا اور اس دھماکے کی لہر نے انہیں موت کی آغوش میں سلا دیا۔

---

[1] سورہ یٰسین آیت 26 تا 27

[2] سورہ یٰسین آیت 28

[3] سورہ یٰسین آیت 29

ایک چیخ وہ جو کچھ بھی تھی لمحہ بھر سے زیادہ نہ تھی، وہ ایک ایسی آواز تھی کہ جس نے سب آوازوں کو خاموش کر دیا اور ایسی ہلا دینے والی تھی کہ جس نے تمام حرکتوں کو بے حرکت کر دیا اور خدا کی قدرت ایسی ہی ہے اور ایک گمراہ اور بے ثمر قوم کا انجام یہی ہوتا ہے۔

بسوزند چوب درختان بی بر

سزا خود همین است مربی

بری را

''بے ثمر درختوں کی لکڑی جلانے ہی کے کام آتی ہے کیونکہ بے ثمر چیز کی سزا یہی ہے۔''

انطاکیہ کے رسولوں کی داستان مجمع البیان کی زبانی

مفسر عالی قدر ''طبرسی'' مجمع البیان میں کہتے ہیں: حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں میں سے اپنے دو نمائندے انطاکیہ کی طرف بھیجے جس وقت وہ شہر کے پاس پہنچے تو انھوں نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا کہ جو چند بھیڑیں چرانے کے لئے لایا تھا، یہ ''حبیب'' صاحب ''یٰس'' تھا، انھوں نے اسے سلام کیا، بوڑھے نے جواب دیا اور پوچھا کہ تم کون ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہم عیسیٰ علیہ السلام کے نمائندے ہیں، ہم اس لئے آئے ہیں کہ تمہیں بتوں کی عبادت کے بجائے خدائے رحمان کی طرف دعوت دیں۔

بوڑھے نے کہا کہ تمہارے پاس کوئی معجزہ یا نشانی بھی ہے؟

انھوں نے کہا: ہاں ہم بیماروں کو شفا دیتے ہیں اور مادرزاد اندھوں اور برص میں مبتلا لوگوں کو حکم خدا سے صحت و تندرستی بخشتے ہیں۔

بوڑھے نے کہا: میرا ایک بیمار بیٹا ہے کہ جو سالہا سال سے بستر پر پڑا ہے۔

انھوں نے کہا: ہمارے ساتھ چلو تا کہ ہم تمہارے گھر جا کر اس کا حال معلوم کریں۔

بوڑھا ان کے ساتھ چل پڑا، انھوں نے اس کے بیٹے پر ہاتھ پھیرا تو وہ صحیح و سالم اپنی جگہ پر اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ خبر پورے شہر میں پھیل گئی اور خدا نے اس کے بعد بیماروں میں سے ایک کثیر گروہ کو ان کے ہاتھ شفا بخشی۔

ان کا بادشاہ بت پرست تھا جب اس تک خبر پہنچی تو اس نے انہیں بلا بھیجا اور ان سے پوچھا کہ تم کون لوگ ہو؟ انھوں نے کہا: کہ ہم عیسیٰ علیہ السلام کے فرستادہ ہیں، ہم اس لئے آئے ہیں کہ یہ موجودات جو نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں ان کی عبادت کے بجائے ہم تمہیں اس کی عبادت کی طرف دعوت دیں جو سنتا بھی ہے اور دیکھتا بھی ہے۔

بادشاہ نے کہا: کیا ہمارے خداؤں کے علاوہ کوئی معبود بھی موجود ہے؟

انھوں نے کہا: ہاں وہی کہ جس نے تجھے اور تیرے معبودوں کو پیدا کیا ہے۔

بادشاہ نے کہا: اٹھ جاؤ کہ میں تمہارے بارے میں کچھ سوچ بچار کروں۔

یہ ان کے لئے ایک دھمکی تھی، اس کے بعد لوگوں نے ان دونوں نمائندوں کو بازار میں پکڑ کر مارا پیٹا۔

لیکن ایک دوسری روایت میں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے ان دونوں نمائندوں کو بادشاہ تک رسائی حاصل نہ ہوئی اور ایک مدت تک وہ اس شہر میں رہے ایک دن بادشاہ اپنے محل سے باہر آیا ہوا تھا تو انھوں نے تکبیر کی آواز بلند کی۔ اور ''اللہ'' کا نام عظمت کے ساتھ لیا، بادشاہ غضب ناک ہوا اور انہیں قید کرنے کا حکم دے دیا اور ہر ایک کو سو کوڑے مارے۔

جس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ان دونوں نمائندوں کی تکذیب ہوگئی اور انھیں زوود کوب کیا گیا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ''شمعون الصفا'' کو ان کے پیچھے روانہ کیا، وہ جو حواریوں کے بزرگ تھے۔

شمعون اجنبی صورت میں شہر میں پہنچے اور بادشاہ کے اطرافیوں سے دوستی پیدا کر لی، انہیں ان کی دوستی بہت بھائی اور ان کے بارے میں بادشاہ کو بھی بتایا، بادشاہ نے بھی ان کو دعوت دی اور انہیں اپنے ہم نشینوں میں شامل کر لیا، بادشاہ ان کا احترام کرنے لگا۔

شمعون نے ایک دن بادشاہ سے کہا: میں نے سنا ہے کہ دو آدمی آپ کی قید میں ہیں اور جس وقت انھوں نے آپ کو آپ کے دین کے بجائے کسی دوسرے دین کی دعوت دی تو آپ نے انہیں مارا پیٹا؟ کیا کبھی آپ نے ان کی باتیں سنی بھی ہیں؟

بادشاہ نے کہا: مجھے ان پر اتنا غصہ آیا کہ میں نے ان کی کوئی بات نہیں سنی۔

شمعون نے کہا: اگر بادشاہ مصلحت سمجھیں تو انہیں بلا لیں تا کہ ہم دیکھیں تو سہی کہ ان کے پلے ہے کیا۔ بادشاہ نے انہیں بلا لیا، شمعون نے یوں ظاہر کیا جیسے انہیں پہچانتے ہی نہ ہوں اور ان سے کہا: تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟

انھوں نے کہا: ''اس خدا نے کہ جس نے سب کو پیدا کیا ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔''

شمعون نے کہا: تمہارا معجزہ اور نشانی کیا ہے؟

انھوں نے کہا: جو کچھ تم چاہو بادشاہ نے حکم دیا اور ایک اندھے غلام کو لایا گیا جسے انھوں نے حکم خدا سے شفا بخشی، بادشاہ کو بہت تعجب ہوا، اس مقام پر شمعون بول اٹھے اور بادشاہ سے کہا: اگر آپ اس قسم کی درخواست اپنے خداؤں سے کرتے تو کیا وہ بھی اس قسم کے کام کی قدرت رکھتے ہیں؟

بادشاہ نے کہا تم سے کیا چھپا ہوا ہے ہمارے یہ خدا کہ جن کی ہم پرستش کرتے ہیں نہ تو کوئی ضرر پہنچا سکتے ہیں، نہ نفع دے سکتے ہیں اور نہ کوئی اور خاصیت رکھتے ہیں۔

اس کے بعد بادشاہ نے ان دونوں سے کہا: اگر تمہارا خدا مردے کو زندہ کر سکتا ہے تو ہم اس پر اور تم پر ایمان لے آئیں گے۔

انھوں نے کہا: ہمارا خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

بادشاہ نے کہا: یہاں ایک مردہ ہے جسے مرے ہوئے سات دن گزر چکے ہیں ابھی تک ہم نے اسے دفن نہیں کیا، ہم اس انتظار میں ہیں کہ اس کا باپ سفر سے آجائے تم اسے زندہ کر دکھاو۔

مردہ کو لایا گیا تو وہ دونوں تو آشکار دعا کر رہے تھے اور شمعون دل ہی دل میں، اچانک مردے میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ میں سات روز سے مر چکا ہوں میں نے جہنم کی آگ اپنی آنکھ سے دیکھی ہے اور میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ تم سب خدائے یگانہ پر ایمان لے آو۔

بادشاہ نے تعجب کیا، جس وقت شمعون کو یقین ہو گیا کہ اس کی باتیں اس پر اثر کر گئی ہیں تو اسے خدائے یگانہ کی طرف دعوت دی اور وہ ایمان لے آیا اور اس کے ملک کے باشندے بھی اس کے ساتھ ایمان لے آئے، اگرچہ کچھ لوگ اپنے کفر پر باقی رہے۔

اس روایت کی نظیر تفسیر عیاشی میں امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی نقل ہوئی ہے، اگرچہ ان کے درمیان کچھ فرق ہے۔

لیکن قرآن کے ظاہر کی طرف توجہ کرتے ہوئے اس شہر والوں کا ایمان لانا بہت بعید نظر آتا ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ وہ صیحہ آسمانی کے ذریعہ ہلاک ہو گئے۔

ممکن ہے کہ روایت کے اس حصہ میں راوی سے اشتباہ ہوا ہو۔

اصحاب الرس

''اصحاب الرس'' کون ہیں اس سلسلے میں بہت اختلاف ہے۔[1]

وہ ایسے لوگ تھے جو ''صنوبر'' کے درخت کی پوجا کرتے تھے اور اسے ''درختوں کا بادشاہ'' کہتے تھے یہ وہ درخت تھا جسے جناب نوح علیہ السلام کے بیٹے ''یافث'' نے طوفان نوح کے بعد ''روشن آب'' کے کنارے کاشت کیا تھا ''رس'' نامی نہر کے کنارے انھوں نے بارہ شہر آباد کر رکھے تھے جن کے نام یہ ہیں: آبان، آذر، دی، بہمن، اسفند، فروردین، اردبہشت، خرداد، تیر، مرداد، شہریور اور مہر، ایرانیوں نے اپنے کلنڈر کے بارہ مہینوں کے نام انہی شہروں کے نام پر رکھے ہوئے ہیں۔

چونکہ وہ درخت صنوبر کا احترام کرتے تھے لہٰذا انھوں نے اس کے بیج کو دوسرے علاقوں میں بھی کاشت کیا اور آبپاشی کے لئے ایک نہر کو مختص کر دیا انھوں نے اس نہر کا پانی لوگوں کے لئے پینا ممنوع قرار دے دیا تھا، حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اس سے پی لیتا اسے قتل کر دیتے تھے وہ کہتے تھے کیونکہ یہ ہمارے خداؤں کا سرمایہ حیات ہے لہٰذا مناسب نہیں ہے کہ کوئی اس سے ایک گھونٹ پانی کو کم کر دے۔

وہ سال کے بارہ مہینوں میں سے ہر ماہ ایک ایک شہر میں ایک دن کے لئے عید منایا کرتے تھے اور شہر سے باہر صنوبر کے درخت کے پاس چلے جاتے اس کے لئے قربانی کرتے اور جانوروں کو ذبح کر کے آگ میں ڈال دیتے جب اس سے دھواں اٹھتا تو وہ درخت کے آگے سجدے میں گر پڑتے اور خوب گریہ کیا کرتے تھے۔ ہر مہینے ان کا یہی طریقہ کار تھا چنانچہ جب ''اسفند'' کی آبادی آتی تو تمام بارہ شہروں کے لوگ یہاں جمع ہوتے اور مسلسل بارہ دن تک وہاں عید منایا کرتے کیونکہ یہ ان کے بادشاہوں کا دارالحکومت تھا یہیں پر وہ مقدور بھر قربانی بھی کیا کرتے اور درخت کے آگے سجدے بھی کیا کرتے۔

جب وہ کفر اور بت پرستی کی انتہا کو پہنچ گئے تو خداوند عالم نے بنی اسرائیل میں سے ایک نبی ان کی طرف بھیجا تا کہ وہ انہیں شرک سے روکے اور خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت کی دعوت دے لیکن وہ اس نبی پر ایمان نہ لائے اب اس نبی نے فساد اور بت پرستی کی اصل جڑ یعنی اس درخت کے قلع قمع کرنے کی خدا سے دعا کی اور بڑا درخت خشک ہو گیا، جب ان لوگوں نے یہ صورت دیکھی تو سخت پریشان ہو گئے اور کہنے لگے کہ اس شخص نے ہمارے خداؤں پر جادو کر دیا ہے کچھ کہنے لگے کہ ہمارے خدا اس شخص کی وجہ سے ہم پر ناراض ہو گئے ہیں کیونکہ وہ ہمیں کفر کی دعوت دیتا ہے۔ اب بحث مباحثے کے بعد سب لوگوں نے اللہ کے اس نبی کو قتل کرنے کی ٹھان

---

[1] سورہ فرقان آیت 38 میں اس ظالم و ستمگر قوم کا ذکر موجود ہے

''رس'' کا لفظ دراصل مختصر اور تھوڑے سے اثر کے معنی میں ہے جیسے کہتے ہیں: ''رس الحدیث فی نفسی'' (مجھے اس کی تھوڑی سی بات یاد ہے) یا کہا جاتا ہے ''وجد رسا من حمی'' (اس نے اپنے اندر بخار کا تھوڑا سا اثر پایا)۔ کچھ مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ ''رس'' کا معنی ''کنواں'' ہے۔ معنی خواہ کچھ بھی ہو اس قوم کو اس نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا اب تھوڑا سا اثر یا بہت ہی کم نام اور نشان باقی رہ گیا ہے یا اس وجہ سے انہیں ''اصحاب الرس'' کہتے ہیں کہ وہ بہت سے کنوؤں کے مالک تھے یا کنوؤں کا پانی خشک ہو جانے کی وجہ سے ہلاک و برباد ہو گئے۔ (رجوع کریں تفسیر نمونہ ج 8 ص 386)

لی اور گہرا کنوں کھودا جس میں اسے ڈال دیا اور کنوئیں کا منہ بند کر کے اس کے اوپر بیٹھ گئے اور اس کے نالہ وفریاد کی آواز سنتے رہے یہاں تک کہ اس نے جان جان آفریں کے سپرد کر دی، خداوند عالم نے انہیں ان برائیوں اور ظلم وستم کی وجہ سے سخت عذاب میں مبتلا کر کے نیست ونابود کر دیا۔

سرسبز باغات کے مالک

قرآن میں پہلے زمانہ کے کچھ دولتمندوں کے بارے میں جو ایک سرسبز وشاداب باغ کے مالک تھے اور آخر کار وہ خودسری کی بناء پر نابود ہو گئے تھے، ایک داستان بیان کرتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ داستان اس زمانہ کے لوگوں میں مشہور ومعروف تھی، اور اسی بناء پر اس کو گواہی کے طور پر پیش کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

''ہم نے انہیں آزمایا، جیسا کہ ہم نے باغ والوں کی آزمائش کی تھی۔''

یہ باغ کہاں تھا، عظیم شہر صنعاء کے قریب سرزمین یمن میں؟ یا سرزمین حبشہ میں؟ یا بنی اسرائیل کی سرزمین شام میں؟ یا طائف میں؟ اس بارے میں اختلاف ہے، لیکن مشہور یمن ہی ہے۔

اس کا قصہ یہ ہے کہ یہ باغ ایک بوڑھے مرد مومن کی ملکیت تھا، وہ اپنی ضرورت کے مطابق اس میں سے لے لیا کرتا اور باقی مستضعفین اور حاجت مندوں کو دے دیتا تھا، لیکن جب اس نے دنیا سے آنکھ بند کر لی (اور مر گیا) تو اس کے بیٹوں نے کہا ہم اس باغ کی پیداوار کے زیادہ مستحق ہیں، چونکہ ہمارے عیال واطفال زیادہ ہیں، لہٰذا ہم اپنے باپ کی طرح عمل نہیں کر سکتے، اس طرح انھوں نے یہ ارادہ کر لیا کہ ان تمام حاجت مندوں کو جو ہر سال اس سے فائدہ اٹھاتے تھے محروم کر دیں، لہٰذا ان کی سرنوشت وہی ہوئی جو قرآن میں بیان ہوئی۔

ارشاد ہوتا ہے: ''ہم نے انہیں آزمایا، جب انھوں نے یہ قسم کھائی کہ باغ کے پھلوں کو صبح کے وقت حاجت مندوں کی نظریں بچا کر چنیں گے اور اس میں کسی قسم کا استثناء نہ کریں گے اور حاجت مندوں کے لئے کوئی چیز بھی نہ رہنے دیں۔''[1]

ان کا یہ ارادہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ کام ضرورت کی بنا پر نہیں تھا، بلکہ یہ ان کے بخل اور ضعیف ایمان کی وجہ سے تھا کیونکہ انسان چاہے کتنا ہی ضرورت مند کیوں نہ ہو اگر وہ چاہے تو کثیر پیداوار والے باغ میں سے کچھ نہ کچھ حصہ حاجت مندوں کے لئے مخصوص کر سکتا ہے۔

اس کے بعد اسی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتا ہے: ''رات کے وقت جب کہ وہ سوئے ہوئے تھے تیرے پروردگار کا ایک گھیر لینے والا عذاب ان کے سارے باغ پر نازل ہو گیا''[2]

ایک جلانے والی آگ اور مرگ بار بجلی اس طرح سے اس کے اوپر مسلط ہوئی کہ: ''وہ سرسبز وشاداب باغ رات کی مانند سیاہ اور تاریک ہو گیا۔[3] اور مٹھی بھر راکھ کے سوا کچھ بھی باقی نہ بچا۔

بہر حال باغ کے مالکوں نے اس گمان سے کہ یہ پھلوں سے لدے درخت اب تیار ہیں کہ ان کے پھل توڑ لئے جائیں: ''صبح ہوتے ہی ایک دوسرے کو پکارا۔ انھوں نے کہا: ''اگر تم باغ کے پھلوں کو توڑنا چاہتے ہو تو اپنے کھیت اور باغ کی طرف

---

[1] سورہ قلم آیت 17-18

[2] سورہ قلم آیت 19

[3] سورہ قلم آیت 20

چلو۔''[1]

''اسی طرح سے وہ اپنے باغ کی طرف چل پڑے اور وہ آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ کہ اس بات کا خیال رکھو کہ ایک بھی فقیر تمہارے پاس نہ آنے پائے۔''[2]

اور وہ اس طرح آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے کہ ان کی آواز کسی دوسرے کے کانوں تک نہ پہنچ جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی فقیر خبردار ہو جائے اور بچے کچے پھل چننے کے لئے یا اپنا پیٹ بھرنے کے لئے تھوڑا سا پھل لینے ان کے پاس آ جائے۔

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ان کے باپ کے سابقہ نیک اعمال کی بناء پر فقراء کا ایک گروہ ایسے دنوں کے انتظار میں رہتا تھا کہ باغ کے پھل توڑنے کا وقت شروع ہو تو اس میں سے کچھ حصہ انہیں بھی ملے، اسی لئے یہ بخیل اور ناخلف بیٹے اس طرح سے مخفی طور پر چلے کہ کسی کو یہ احتمال نہ ہو کہ اس قسم کا دن آ پہنچا ہے، اور جب فقراء کو اس کی خبر ہو تو معاملہ ختم ہو چکا ہو۔

''اسی طرح سے وہ صبح سویرے اپنے باغ اور کھیت میں جانے کے ارادے سے حاجت مندوں اور فقراء کو روکنے کے لئے پوری قوت اور پختہ ارادے کے ساتھ چل پڑے۔''[3]

سرسبز باغ کے مالکوں کا دردناک انجام

وہ باغ والے اس امید پر کہ باغ کی فراواں پیداوار کو چنیں اور مساکین کی نظریں بچا کر اسے جمع کر لیں اور یہ سب کچھ اپنے لئے خاص کر لیں، یہاں تک کہ خدا کی نعمت کے اس وسیع دسترخوان پر ایک بھی فقیر نہ بیٹھے، یوں صبح سویرے چل پڑے لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ رات کے وقت جب کہ وہ پڑے سو رہے تھے ایک مرگبار صاعقہ نے باغ کو ایک مٹھی بھر خاکستر میں تبدیل کر دیا ہے۔

قرآن کہتا ہے: ''جب انھوں نے اپنے باغ کو دیکھا تو اس کا حال اس طرح سے بگڑا ہوا تھا کہ انھوں نے کہا یہ ہمارا باغ نہیں ہے، ہم تو راستہ بھول گئے ہیں۔''[4]

پھر انھوں نے مزید کہا: ''بلکہ ہم تو حقیقت میں محروم ہیں۔''[5]

ہم چاہتے تھے کہ مساکین اور ضرورت مندوں کو محروم کریں لیکن ہم تو خود سب سے زیادہ محروم ہو گئے ہیں مادی منافع سے بھی محروم ہو گئے ہیں اور معنوی برکات سے بھی کہ جو راہ خدا میں خرچ کرنے اور حاجت مندوں کو دینے سے ہمارے ہاتھ آتیں۔

''اس اثنا میں ان میں سے ایک جو سب سے زیادہ عقل مند تھا، اس نے کہا: ''کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم خدا کی تسبیح کیوں نہیں کرتے۔''[6]

کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ خدا کو عظمت کے ساتھ یاد کرو اور اس کی مخالفت سے بچو، اس کی نعمت کا شکریہ بجالاؤ اور حاجت

---

[1] سورہ قلم آیت 21
[2] سورہ قلم آیت 21، 22
[3] سورہ قلم آیت 23، 24
[4] سورہ قلم آیت 26
[5] سورہ قلم آیت 27
[6] سورہ قلم آیت 28

مندوں کو اپنے سوال سے بہرہ مند کرو لیکن تم نے میری بات کو توجہ سے نہ سنا اور بدبختی کے گڑھے میں جا گرے۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ایک مرد مومن تھا جو انہیں بخل اور حرص سے منع کیا کرتا تھا، چونکہ وہ اقلیت میں تھا لہٰذا کوئی بھی اس کی بات پر کان نہیں دھرتا تھا لیکن اس دردناک حادثہ کے بعد اس کی زبان کھل گئی، اس کی منطق زیادہ تیز اور زیادہ کاٹ کرنے والی ہوگئی، اور وہ انہیں مسلسل ملامت اور سرزنش کرتا رہا۔

وہ بھی ایک لمحہ کے لئے بیدار ہوگئے اور انھوں نے اپنے گناہ کا اعتراف کرلیا: ''انھوں نے کہا: ہمارا پروردگار پاک اور منزہ ہے، یقیناً ہم ہی ظالم وستمگر تھے،[1] ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا اور دوسروں پر بھی۔''

لیکن مطلب یہیں پر ختم نہیں ہوگیا: ''انھوں نے ایک دوسرے کی طرف رخ کیا اور ایک دوسرے کی ملامت وسرزنش کرنے لگے''۔[2]

احتمال یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنی خطا کے اعتراف کے باوجود اصلی گناہ کو دوسرے کے کندھے پر ڈالتا اور شدت کے ساتھ اس کی سرزنش کرتا تھا کہ ہماری بربادی کا اصل عامل تو ہے ورنہ ہم خدا اور اس کی عدالت سے اس قدر بیگانے نہیں تھے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ جب وہ اپنی بدبختی کی انتہا سے آگاہ ہوئے تو ان کی فریاد بلند ہوئی اور انھوں نے کہا: ''وائے ہو ہم پر کہ ہم ہی سرکشی اور طغیان کرنے والے تھے۔''[3]

آخر کار انھوں نے اس بیداری، گناہ کے اعتراف اور خدا کی بازگشت کے بعد اس کی بارگاہ کی طرف رجوع کیا اور کہا: ''امید ہے کہ ہمارا پروردگار ہمارے گناہوں کو بخش دے گا اور ہمیں اس سے بہتر باغ دے گا، کیونکہ ہم نے اس کی طرف رخ کرلیا ہے اور اس کی پاک ذات کے ساتھ لو لگالی ہے۔ لہٰذا اس مشکل کا حل بھی اسی کی بے پایاں قدرت سے طلب کرتے ہیں۔''[4]

کیا یہ گروہ واقعاً اپنے فعل پر پشیمان ہوگیا تھا، اس نے پرانے طرز عمل میں تجدید نظر کرلی تھی اور قطعی اور پختہ ارادہ کرلیا تھا کہ اگر خدا نے ہمیں آئندہ اپنی نعمتوں سے نوازا تو ہم اس کے شکر کا حق ادا کریں گے؟ یا وہ بھی بہت سے ظالموں کی طرح کہ جب وہ عذاب میں گرفتار ہوتے ہیں تو وقتی طور پر بیدار ہوجاتے ہیں، لیکن جب عذاب ختم ہوجاتا ہے تو وہ دوبارہ انہیں کاموں کی تکرار کرنے لگتے ہیں۔

اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ آیت کے لب ولہجہ سے احتمالی طور پر جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی توبہ شرائط کے جمع نہ ہونے کی بناء پر قبول نہیں ہوئی، لیکن بعض روایات میں آیا ہے کہ انھوں نے خلوص نیت کے ساتھ توبہ کی، خدا نے ان کی توبہ قبول کرلی اور انھیں اس سے بہتر باغ عنایت کیا جس میں خاص طور پر بڑے بڑے خوشوں والے انگور کے پُر میوہ درخت تھے۔

قرآن آخر میں کلی طور پر نتیجہ نکالتے ہوئے سب کے لئے ایک درس کے عنوان سے فرماتا ہے: ''خدا کا عذاب اس طرح کا

---

[1] سورہ قلم آیت 29
[2] سورہ قلم آیت 30
[3] سورہ قلم آیت 31
[4] سورہ قلم آیت 32

ہوتا ہے اور اگر وہ جانیں تو آخرت کا عذاب تو بہت ہی بڑا ہے۔''[1]

قوم سبا

قوم سبا ایک ایسی جمعیت اور قوم تھی کہ جو جزیرہ عرب میں رہتی تھی، اور ایک اعلیٰ حکومت اور درخشاں تمدن کی مالک تھی۔

یمن کا علاقہ وسیع اور زرخیز تھا لیکن زرخیز علاقہ ہونے کے باوجود چونکہ وہاں کوئی اہم دریا نہیں تھا، لہٰذا اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاتا تھا، سیلاب اور بارشیں پہاڑوں پر برستی تھیں اور ان کا پانی بیابانوں میں بے کار اور بے فائدہ ضائع ہوجاتا تھا، اس سر زمین کے سمجھدار لوگ ان پانیوں سے استفادہ کرنے کی فکر میں لگ گئے اور اہم علاقوں میں بہت سے بند باندھے، جن میں سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ پانی کا ذخیرہ رکھنے والا بند ''مارب''[2] تھا۔

''مارب'' (بروزن مغرب) ایک شہر تھا کہ جو ان دروں میں سے ایک کے آخر میں واقع تھا، اور ''صراۃ'' کے کوہستانوں کے بڑے بڑے سیلاب اس کے قریب سے گزرتے تھے، اس درہ کے دہانہ پر ''بلق'' نامی دو پہاڑوں کے دامن میں انھوں نے ایک مضبوط بند بنایا تھا، اور اس میں سے پانی کی کئی نہریں نکالی تھیں، اس بند کے اندر پانی کا اس قدر ذخیرہ جمع ہوگیا تھا کہ جس سے استفادہ کرتے ہوئے وہ اس بات پر قادر ہوگئے تھے کہ اس نہر کے دونوں طرف، کہ جو بند تک جاتی تھی، بہت ہی خوبصورت و زیبا باغات لگائیں اور پر برکت کھیت تیار کریں۔

اس سر زمین کی آبادبستیاں ایک دوسری سے متصل تھیں اور درختوں کے وسیع سائے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے، اور ان کی شاخوں پر اتنے پھل لگا کرتے تھے کہ کہتے ہیں کہ جب کوئی آدمی اپنے سر پر ایک ٹوکری رکھ کر ان کے نیچے سے گزرتا تھا تو یکے بعد دیگرے اتنے پھل اس میں آکر گرتے تھے کہ تھوڑی ہی دیر میں وہ ٹوکری بھر جاتی تھی۔

امن وامان کے ساتھ نعمت کے وفور نے پاک وصاف زندگی کے لئے بہت ہی عمدہ اور مرفہ ماحول پیدا کر رکھا تھا، ایک ایسا ماحول جو خدا کی اطاعت اور معنوی پہلوؤں کے ارتقاء وتکامل کے لئے مہیا تھا۔

لیکن انھوں نے ان تمام نعمتوں کی قدر کو نہ پہچانا اور خدا کو بھول گئے اور کفران نعمت میں مشغول ہوگئے، اور فخر ومباہات کرنے لگے اور طبقاتی اختلاف پیدا کر دیئے۔

صحرائی چوہوں نے مغرور ومست لوگوں کی آنکھوں سے دور، مٹی کے اس بند کی دیوار کا رخ کیا اور اسے اندر سے کھوکھلا کر دیا، اچانک ایسی شدید بارشیں برسیں اور ایسا عظیم سیلاب آیا کہ جس سے بند کی وہ دیواریں کہ جو سیلاب کے دباؤ کو برداشت کرنے کے قابل نہ رہی تھیں دھڑام سے گر پڑیں اور بہت ہی زیادہ پانی کہ جو بند کے اندر جمع ہو رہا تھا، اچانک باہر نکل پڑا اور تمام آبادیوں، باغات، کھیتوں، فصلوں اور چوپایوں کو تباہ کر کے رکھ دیا اور خوبصورت سجے سجائے قصور ومحلات اور مکانات کو ویران کر دیا اور اس کے بعد آباد سرزمین کو خشک اور بے آب وگیاہ صحرا میں بدل دیا اور ان تمام سرسبز وشاداب باغوں اور پھلدار درختوں میں سے صرف چند ''اراک'' کے کڑوے شجر، کچھ، جھاؤ اور کچھ بیری کے درخت باقی رہ گئے، غزل خوانی کرنے والے پرندے وہاں سے کوچ کر گئے اور الوؤں اور کوّوں نے ان کی جگہ لے لی۔

---

[1] سورہ قلم آیت 33

[2] مغرب کے وزن پر

ہاں جب خدا اپنی قدرت دکھانا چاہتا ہے تو چوہوں کے ذریعہ ایک عظیم تمدن کو برباد کر دیتا ہے، تاکہ بندے اپنے ضعف اور کمزوری سے آگاہ ہو جائیں، اور قدرت اور اقتدار کے وقت مغرور نہ ہوں۔

اس بارے میں کہ ''سبا'' کس کا نام ہے؟ اور یہ کیا چیز ہے؟ مؤرخین کے درمیان اختلاف ہے،

لیکن مشہور یہ ہے کہ ''سباء''، ''یمن'' کے اعراب کے باپ کا نام ہے اور اس روایت کے مطابق کہ جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہے، وہ ایک آدمی تھا اور اس کا نام ''سباء'' تھا اور اس کے دس بیٹے تھے، اور ان میں سے ہر ایک سے وہاں کے قبائل میں سے ایک قبیلہ وجود میں آیا۔ [1]

ایک درخشاں تمدن جو کفران نعمت کی وجہ سے برباد ہو گیا

قرآن مجید نے ان کی عبرت انگیز سرگزشت بیان کی ہے، اور ان کی زندگی کے جزئیات وخصوصیات کے اہم حصہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

پہلے کہتا ہے: ''قوم سبا کے لئے ان کے محل سکونت میں خدائی قدرت کی ایک نشانی تھی''۔ [2]

جیسا کہ ہم دیکھیں گے، خدا کی اس بزرگ آیت کا سرچشمہ یہ تھا کہ قوم سباء اس علاقے کے اطراف میں واقع پہاڑوں کے محل وقوع اور ان کے خاص حالات وشرائط، اور اپنی خداداد ذہانت اور ہوشمندی سے استفادہ کرتے ہوئے، ان سیلابوں کو کہ جو سوائے ویرانی وتباہی کے کوئی نتیجہ نہ دیتے تھے، ایک قوی اور مستحکم بند کے پیچھے روک دینے پر قادر ہو گئے تھے اور اس کے ذریعہ انھوں نے بہت ہی آباد ملک تعمیر کر لیا تھا، یہ کتنی عظیم آیت ہے کہ ایک ویران اور برباد کرنے والا عامل، عمران وآبادی کے اہم ترین عوامل میں بدل جائے۔

جب کہ زیر بحث آیت کا ظاہر یہ ہے کہ سبا ایک قوم تھی کہ جو اس علاقے میں رہتی تھی، کیونکہ ضمیر جمع مذکر (**هم**) ان کی طرف لوٹ رہی ہے۔ لیکن ان دونوں تفسیروں میں کوئی منافات نہیں ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ ابتداء میں سبا کسی شخص کا نام ہو، پھر اس کے تمام بیٹے اور قوم اس نام سے موسوم ہوں اور اس کے بعد یہ نام اس سرزمین کی طرف بھی منتقل ہو گیا ہو۔

اس کے بعد قرآن اس خدائی آیت کی تفسیر کی تشریح کرتے ہوئے کہ جو قوم سباء کے اختیار میں قرار پائی تھی، اس طرح کہتا ہے: ''دو بڑے باغ تھے دائیں اور بائیں طرف''

یہ دونوں باغ کوئی معمولی اور سادہ قسم کے باغ نہیں تھے، بلکہ یہ ایک عظیم نہر کے دونوں طرف باغوں کا مسلسل اور ملا ہوا سلسلہ تھا، جو اس عظیم بند کے ذریعہ سیراب ہوتے تھے قوم سباء اس عظیم بند کے ذریعہ، جو انھوں نے اس علاقہ کے اہم پہاڑوں کے درمیان بنایا تھا، اس بات پر قادر ہو گئی تھی کہ ان فراواں سیلابوں کو، جو ویرانی کا سبب بنتے تھے یا کم از کم بیابانوں میں بے کار وفضول طور سے ضائع اور تلف ہو جاتے تھے، اس بند کے پیچھے ذخیرہ کر لیں، اور اس کے اندر کھڑکیاں بنا کر پانی کے اس عظیم مخزن سے استفادہ کرنے کے لئے اپنے کنٹرول میں کر لیں اور اس طرح سے وسیع وعریض زمینوں کو زیر کاشت لائیں۔

وہی سیلاب کہ جو خرابی وبربادی کا باعث بنیں، وہ اس طرح سے آبادی کا باعث بن جائیں، کیا یہ عجیب بات نہیں ہے؟ کیا

---

[1] بعض ''سباء'' کو سرزمین یمن کا اس کے کسی علاقے کا نام سمجھتے ہیں، سورہ نمل میں سلیمان وہدہد کے قصہ میں قرآن مجید کا ظاہر بھی یہی نشاندہی کرتا ہے ''سبا'' کسی جگہ، علاقے یا مقام کا نام ہے، جہاں پر وہ کہتا ہے کہ ''میں سرزمین سبا سے تیرے پاس ایک یقینی خبر لے کر آیا ہوں۔''

[2] سورہ سباء آیت 15

یہ خدا کی عظیم آیت اور نشانی شمار نہیں ہوتی۔؟

یہ بات تو آبادی کے لحاظ سے ہے، لیکن چونکہ لوگوں کی آبادی کافی نہیں ہے، بلکہ اہم اور بنیادی شرط امن و امان ہوتا ہے، لہٰذا مزید کہتا ہے: ''ہم نے ان آبادیوں کے درمیان مناسب اور نزدیک نزدیک فاصلے رکھے'' (تاکہ وہ آسانی اور امن وامان کے ساتھ ایک دوسری جگہ آجاسکیں) اور ہم نے ان سے کہا: ''تم ان بستیوں کے درمیان راتوں میں اور دنوں میں پورے امن وامان کے ساتھ سفر کرو، اور ان آبادیوں میں چلو پھرو۔''[1]

اس طرح یہ آبادیاں مناسب اور جچا تلا فاصلہ رکھتی تھیں، اور وحشی اور بیابانی درندوں، یا چوروں اور ڈاکوؤں کے حملہ کے لحاظ سے بھی انتہائی امن وامان میں تھیں، اس طرح سے کہ لوگ زادراہ، سفرخرچ اور سواری کے بغیر ہی، اس صورت میں کہ نہ اکٹھے قافلوں میں چلنے کی ضرورت تھی اور نہ ہی مسلح افراد ساتھ لینے کی کوئی احتیاج تھی، راستے کی بے امنی کی جہت سے، یا پانی اور غذا کی کمی کی وجہ سے کسی ڈر اور خوف کے بغیر اپنا سفر جاری رکھ سکتے تھے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ''ہم نے ان سے کہا کہ اپنے پروردگار کی فراواں روزی میں سے کھاؤ اور اس کا شکر ادا کرو۔ ایک پاک و پاکیزہ شہر ہے اور پروردگار بخشنے والا اور مہربان ہے۔''

اس چھوٹے سے جملے نے تمام مادی و معنوی نعمتوں کے مجموعے کو زیباترین شکل میں منعکس کر دیا ہے، مادی نعمتوں کے لحاظ سے تو وہ پاک و پاکیزہ زمین رکھتے تھے کہ جو چوروں، ظالموں، آفات و بلیات، خشک سالی وقحط اور بدامنی و وحشت جیسے طرح طرح کے مصائب سے پاک تھی، یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ وہ زمین موذی حشرات سے بھی پاک و پاکیزہ تھی، پاک و پاکیزہ ہوائیں چلتی تھیں اور فرحت بخش نسیم رواں دواں تھی، زمین زرخیز تھی اور درخت پُر بار تھے۔

اور معنوی نعمت کے لحاظ سے خدا کی بخشش وغفران ان کے شامل حال تھی، وہ ان کی تقصیر وکوتاہی پر صرف نظر کرتا تھا اور انہیں مشمول عذاب اور ان کی سرزمین کو بلا ومصیبت میں گرفتار نہیں کرتا تھا۔

لیکن ان ناشکرے لوگوں نے ان تمام نعمتوں کی قدردانی نہیں کی اور آزمائش کی بھٹی سے صحیح وسالم باہر نہ آسکے، انھوں نے کفران نعمت اور روگردانی کی راہ اختیار کر لی لہٰذا خدا نے بھی ان کی سختی کے ساتھ گوشمالی کی۔

اسی لئے خداوند عالم فرماتا ہے: ''وہ خدا سے روگرداں ہو گئے۔''[2]

یہ وہ موقع تھا کہ عذاب کا کوڑا ان کے پیکر پر آکر پڑا، جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ''ہم نے بنیادوں کو اکھاڑ کر پھینک دینے والا وحشت ناک سیلاب ان کے پاس بھیجا'' اور ان کی آباد سرزمین ایک ویرانے میں بدل گئی۔

اس کے بعد قرآن اس سرزمین کی باقی ماندہ حالت وکیفیت کی اس طرح سے توصیف کرتا ہے: ''ہم نے ان کے دو وسیع اور پرنعمت باغوں کو، بے قدر و قیمت کڑوے پھلوں والے، اور جھاؤ کے بے مصرف درختوں اور تھوڑے سے بیری کے درختوں میں بدل دیا۔''

اور اس طرح سے ان تمام سرسبز وشاداب درختوں کے بجائے، بہت ہی کم قدر و قیمت والے بیابانی اور جنگلی قسم کے چند ایک درخت، کہ شاید ان میں سے سب سے زیادہ اہم درخت وہی بیری کے درخت تھے، کہ وہ بھی تھوڑی سی ہی مقدار میں، باقی رہ گئے

---

[1] سورہ سباء آیت 18

[2] سورہ سباء آیت 16

تھے،(اب تم اس کی اس مجمل داستان کو پڑھنے کے بعد خود ہی ان کی مفصل داستان کا اندازہ لگالو، کہ خود ان کے اوپر اور ان کی آباد سر زمین پر کیا گزری؟)

ممکن ہے کہ ان تین قسم کے درختوں کا بیان ہے کہ جو اس سرزمین میں باقی رہ گئے تھے،(درختوں کے) تین مختلف گروہوں کی طرف اشارہ ہو، کہ ان درختوں میں سے ایک حصہ نقصان دہ تھا بعض بے مصرف تھے۔اور بعض بہت ہی کم نفع دینے والے تھے۔

ہم نے انہیں اس طرح منتشر کیا کہ ضرب المثل بن گئے

کس قدر عمدہ تعبیر ہے، قرآن اس جملہ کے بعد، کہ جو ان کے دردناک انجام کے بارے میں بیان کیا ہے، کہتا ہے: ''ہم نے انہیں ایسی سزا دی اور ان کی زندگی لپیٹ کر رکھ دیا کہ: انہیں ہم نے دوسروں کے لئے داستان اور افسانہ بنا دیا۔''[1]

ہاں ان کی تمام تر بارونق زندگی اور درخشاں و وسیع تمدن میں سے زبانی قصوں، دلوں کی یادوں اور تاریخوں کے صفحات پر چند سطروں کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا: ''اور ہم نے انہیں بری طرح سے حیران و پریشان کر دیا۔''[2]

ان کی سرزمین ایسی ویران ہوئی کہ ان میں وہاں قیام کرنے کی طاقت نہ رہی، اور زندگی کو باقی رکھنے کے لئے وہ اس بات پر مجبور ہو گئے کہ ان میں سے ہر گروہ کسی طرف رخ کرے اور خزاں کے پتوں کی طرح، کہ جو تند و تیز ہواؤں کے اندر ادھر ادھر مارے مارے پھرتے ہیں، ہر ایک کسی گوشہ میں جا گرے، اس طرح سے کہ ان کی پریشانی ضرب المثل بن گئی، کہ جب کبھی لوگ یہ کہنا چاہتے کہ فلاں جمعیت سخت پراگندہ اور تتر بتر ہو گئی تو وہ یہ کہا کرتے تھے کہ: (وہ قوم سباء اور ان کی نعمتوں کی طرح پراگندہ ہو گئے ہیں)۔

بعض مفسرین کے قول کے مطابق قبیلہ ''غسان'' شام کی طرف گیا اور ''اسد'' عمان کی طرف، ''خزاعہ'' تہامہ کی طرف، اور قبیلہ ''انمار'' یثرب کی طرف۔

اور آخر میں فرماتا ہے: ''یقیناً اس سرگزشت میں، صبر اور شکر کرنے والوں کے لئے عبرت کی آیات اور نشانیاں ہیں۔''[3]

دو دوست یا دو برادر

قرآن میں دو دوست یا دو بھائی کی داستان مثال کے طور پر بیان کی گئی ہے۔ان میں سے ہر ایک مستکبرین اور مستضعفین کا ایک نمونہ تھا۔ان کی طرز فکر اور ان کی گفتار و کردار ان دونوں گروہوں کے موقف کا ترجمان تھے۔ پہلے فرمایا گیا ہے: ''اے رسول ان سے دو شخصوں کی مثال بیان کرو کہ جن میں سے ایک کو ہم نے انگوروں کے دو باغ دیئے تھے۔ جو طرح طرح کے انگور تھے۔ان کے گرداگرد کھجور کے درخت آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ان دونوں باغوں کے درمیان ہری بھری کھیتی تھی''۔[4]

ایسے باغ اور کھیتیاں جن میں ہر چیز خوب تھی۔انگور بھی تھے، کھجوریں بھی تھیں، گندم اور دوسرا اناج بھی تھا۔خود کفیل کھیتیاں تھیں۔ یہ دونوں باغ پیداوار کے لحاظ سے بھرے پڑے تھے۔درخت پھلوں سے لدے ہوئے تھے اور کھیتیوں کے پودے خوب

---

[1] سورہ سباء آیت 9

[2] سورہ سباء آیت 9

[3] سورہ سباء آیت 19

[4] سورہ کہف آیت 32

خوشہ دار تھے۔ان دونوں باغوں میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔[1]

سب سے اہم بات یہ ہے کہ پانی جو ہر چیز کے لئے مایہ حیات ہے،خصوصاً باغات و زراعت کے لئے،انہیں فراہم تھا:''کیونکہ دونوں باغوں کے درمیان ہم نے ایک نہر جاری کی تھی''۔[2]

''اس طرح سے ان باغات اور کھیتیوں کے مالک کو خوب پیداوار ملتی تھی''۔[3]

دنیا کا مقصد پورا ہو رہا ہو اور تو کم ظرف اور بے وقعت انسان اپنی دنیاوی مراد پا کر غرور و تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے اور سرکشی کرنے لگتا ہے۔پہلے وہ دوسروں کے مقابلے میں اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگتا ہے۔باغات کے اس مالک نے بھی اپنے دوست سے بات کرتے ہوئے کہا:''میں دولت اور سرمائے کے لحاظ سے تجھ سے برتر ہوں،میری آبرو،عزت اور حیثیت تجھ سے زیادہ ہے''۔[4]

اور افرادی قوت بھی میرے پاس بہت زیادہ ہے۔مال و دولت اور اثر و رسوخ میرا زیادہ ہے۔معاشرے میں میری حیثیت زیادہ ہے۔تو میرے مقابلے میں کیا ہے اور تو کس کھاتے میں ہے؟

آہستہ آہستہ اس کے خیالات بڑھتے چلے گئے اور بات یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ دنیا کو جاوداں،مال و دولت کو ابدی اور مقام و حشمت کو دائمی خیال کرنے لگا۔''وہ مغرور تھا حالانکہ وہ خود اپنے آپ پر ظلم کر رہا تھا۔ایسے میں اپنے باغ میں داخل ہوا اس نے ایک نگاہ سرسبز درختوں پر ڈالی جن کی شاخیں پھلوں کے بوجھ سے خم ہو گئی تھیں۔اس نے اناج کی ڈالیوں کو دیکھا،نہر کے آب رواں کی لہروں پر نظر کی کہ جو چلتے چلتے درختوں کو سیراب کر رہا تھا۔ایسے میں وہ سب کچھ بھول گیا اور کہنے لگا میرا خیال نہیں ہے کہ میرا باغ بھی کبھی اجڑے گا''۔[5]

پھر اس نے اس سے بھی آگے کی بات کی۔اس جہان کا دائمی ہونا چونکہ عقیدہ قیامت کے منافی ہے لہٰذا وہ انکار قیامت کا سوچنے لگا۔اس نے کہا:میرا ہرگز نہیں خیال کہ کوئی قیامت بھی ہے۔[6]

پھر مزید کہنے لگا:فرض کیا جائے کہ قیامت ہو بھی''اور میں اپنی اس حیثیت اور مقام کے ساتھ اپنے رب کے پاس جاؤں بھی تو یقیناً اس سے بہتر جگہ پاؤں گا''۔[7]

وہ ان خام خیالوں میں غرق تھا اور ایک کے بعد دوسری فضول بات کرتا جاتا تھا۔

مستضعفین کا جواب

قرآن میں اس مغرور،بے ایمان،خودغرض دولت مند کی بے بنیاد باتوں کا جواب اس کے مومن دوست کی زبانی دیا گیا ہے۔پہلے وہ خاموشی سے اس کوتاہ فکر انسان کی باتیں سنتا رہا تا کہ جو کچھ اس کے اندر ہے باہر آجائے اور پھر ایک ہی بار اسے جواب دیا

---

[1] سورہ کہف آیت 32
[2] سورہ کہف آیت 33
[3] سورہ کہف آیت 33
[4] سورہ کہف آیت 34
[5] سورہ کہف آیت 34
[6] سورہ کہف آیت 35
[7] سورہ کہف آیت 36

جائے۔''اس نے کہا: کیا تو اس خدا سے کافر ہو گیا ہے جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا اور پھر تجھے پورا شخص بنایا''۔[1]

اس کے بعد اس باایمان شخص نے اس کے کفر اور غرور کو توڑنے کے لئے کہا:''لیکن میرا تو ایمان ہے کہ اللہ میرا پروردگار ہے،[2] اور مجھے اس عقیدے پر فخر ہے''۔

تو اس بات پر نازاں ہے کہ تیرے پاس باغات، کھیتیاں، پھل اور پانی فراواں ہیں لیکن مجھے اس پر فخر ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے، میرا خالق و رازق وہ ہے، تجھے اپنی دنیا پر فخر ہے اور مجھے اپنے عقیدہ توحید و ایمان پر،''اور میں کسی کو اپنے رب کا شریک قرار نہیں دیتا''۔[3]

توحید اور شرک کا مسئلہ انسان کی سرنوشت میں اہم ترین کردار ادا کرتا ہے۔ پھر اس کے بارے میں گفتگو اگے بڑھائی اور اس کی ملامت کرتے ہوئے کہا:''جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا تو تو نے یہ کیوں نہیں کہا کہ یہ نعمت اللہ کی منشا سے ہے''۔[4] تو نے اسے اللہ کی جانب سے کیوں نہیں جانا اور اس کا شکر کیوں نہیں بجالایا۔''تو نے کیوں نہیں کہا کہ اللہ کے سوا کسی کی کچھ طاقت نہیں''۔[5]

اگر تو نے زمین میں ہل چلایا ہے، بیج بویا ہے، درخت لگائے ہیں، قلمیں لگائی ہیں اور تجھے ہر موقع پر سب کچھ میسر آیا ہے یہاں تک کہ تو اس مقام پر پہنچا ہے تو سب اللہ کی قدرت سے استفادہ کرنے کی وجہ سے ہے۔ یہ تمام وسائل اور صلاحتیں تجھے اللہ نے بخشی ہیں، اپنی طرف سے تو کچھ بھی تیرے پاس نہیں ہے اور اس کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد اس نے مزید کہا:''یہ جو تجھے نظر آتا ہے کہ میں مال و اولاد کے لحاظ سے تجھ سے کم ہوں (یہ کوئی اہم بات نہیں ہے)۔ اللہ تیرے باغ کی نسبت مجھے بہتر عطا کر سکتا ہے''۔[6]

''بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خدا آسمان سے تیرے باغ پر بجلی گرائے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ سرسبز و شاداب زمین ایسے چٹیل

---

[1] سورہ کہف آیت 36

[2] سورہ کہف آیت 37

[3] یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ گزشتہ میں مغرور شخص کی جو باتیں ہم نے پڑھی ہیں ان میں وجود خدا کا صریح انکار تو موجود نہیں ہے جبکہ ایک توحید پرست شخص اسے جو جواب دے رہا ہے ظاہراً سب سے پہلے اسے انکار خدا پر سرزنش کر رہا ہے اور اسے تخلیق انسان کے حوالے سے خدائے عالم و قادر کی طرف متوجہ کر رہا ہے کیونکہ تخلیق انسان دلائل توحید میں سے بہت واضح دلیل ہے۔

مفسرین نے مذکورہ سوال کے جواب میں مختلف تفسیریں پیش کی ہیں، مثلاً:

1۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس مغرور شخص نے صراحت کے ساتھ معاد اور قیامت کا انکار کیا ہے یا پھر اسے شک کی نظر سے دیکھا ہے جس کا لازمی نتیجہ انکار خدا ہے کیونکہ معاد جسمانی کے منکر درحقیقت قدرت خدا کے منکر ہیں۔ انہیں اس بات پر یقین نہیں کہ منتشر ہو جانے کے بعد مٹی پھر سے لباس حیات پہن سکے گی۔

2۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے شرک اور کفر کی وجہ یہ تھی کہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ مالکیت خود اس کی اپنی طرف سے ہے۔ یعنی وہ اپنے لئے مالکیت کا قائل تھا اور اپنی مالکیت کو جاودانی خیال کرتا تھا۔

3۔ تیسرا احتمال بھی بعید نظر نہیں آتا، وہ یہ کہ اس نے اپنی کچھ باتوں میں خدا کا انکار کیا تھا اور اللہ تعالی نے اس کی ساری باتیں بیان نہیں کیں۔ اس کا اندازہ اس باایمان شخص کی باتوں سے کیا جا سکتا ہے۔

[4] سورہ کہف آیت 38

[5] سورہ کہف آیت 38

[6] سورہ کہف آیت 39

میدان میں بدل جائے کہ جہاں پاؤں پھسلتے ہوں''۔[1]

یا زمین کو حکم دے کہ وہ ہل جائیں اور ''یہ چشمے اور نہریں اس کی تہہ میں ایسی چلی جائیں کہ پھر تو انہیں پا نہ سکے''۔[2]

دراصل وہ کہتا ہے کہ تو نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یا کم از کم سنا ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آسمان سے بجلی لمحہ بھر میں باغوں، گھروں اور کھیتوں کو مٹی کے ٹیلوں یا بے آب و گیاہ زمین میں بدل کے رکھ دیتی ہے۔ نیز تو نے سنا ہے یا دیکھا ہے کبھی زمین پر ایسا زلزلہ آتا ہے کہ چشمے خشک ہو جاتے ہیں اور نہریں نیچے چلی جاتی ہیں اسطرح سے کہ وہ قابل اصلاح بھی نہیں رہتیں۔ جب تو ان چیزوں کو جانتا ہے تو پھر یہ غرور و غفلت کس بناء پر؟ تو نے یہ منظر دیکھے ہیں تو پھر یہ دل بستگی آخر کیوں؟ تو یہ کہتا ہے کہ میں نہیں سمجھتا کہ یہ نعمتیں کبھی فنا ہوں گی اور تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ ہمیشہ رہیں گی۔ یہ کیسی نادانی اور حماقت ہے؟

اور یہ ان کا انجام

ان دونوں کی آپس کی گفتگو ختم ہو گئی۔ اس خدا پرست شخص کی باتوں کا اس مغرور و بے ایمان دولت مند کے دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنے انہی جذبات اور طرز فکر کے ساتھ اپنے گھر لوٹ گیا۔ اسے اس بات کی خبر نہ تھی کہ اس کے باغوں اور سرسبز کھیتوں کی تباہی کے لئے اللہ کا حکم صادر ہو چکا ہے۔ اسے خیال نہ تھا کہ وہ اپنے تکبر اور شرک کی سزا اسی جہان میں پالے گا اور اس کا انجام دوسروں کے لئے باعث عبرت بن جائے گا۔

شاید اس وقت کہ جب رات کی تاریکی ہر چیز پر چھائی ہوئی تھی، عذاب الٰہی نازل ہوا تباہ کن بجلی کی صورت میں یا وحشت ناک طوفان کی شکل میں یا ہولناک زلزلے کی صورت میں اللہ کا عذاب نازل ہوا۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا اس نے چند لمحوں میں تر و تازہ باغات، سر بہ فلک درخت اور خوشوں سے لدی کھیتیاں درہم برہم اور تباہ کر دیں۔ ''اور عذاب الٰہی حکم خدا سے ہر طرف سے اس کے ثمرہ پر محیط ہو گیا اور اسے نابود کر دیا''۔[3]

دن چڑھا۔ باغ کا مالک باغ کی طرف چلا۔ سرکشی اسکے ذہن میں تھی۔ وہ اپنے باغات کی پیداوار سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی فکر میں تھا، جب وہ باغ کے قریب پہنچا تو اچانک اس نے وحشت ناک منظر دیکھا۔ حیرت سے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی اور وہ وہاں بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا۔

اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ یہ خواب دیکھ رہا ہے یا حقیقت۔ سب درخت اوندھے پڑے تھے، کھیتیاں زیر و زبر ہو چکی تھیں۔ زندگی کے کوئی آثار وہاں دکھائی نہ دیتے تھے۔ گویا وہاں کبھی بھی شاداب و سرسبز باغ اور کھیتیاں نہ تھیں۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ حلق خشک ہو گیا۔ اس کے دل و دماغ سے سب غرور و نخوت جاتی رہی، اسے ایسے لگا جیسے وہ ایک طویل اور گہری نیند سے بیدار ہوا ہے، ''وہ مسلسل اپنے ہاتھ مل رہا تھا، اسے ان اخراجات کا خیال آ رہا تھا جو اس نے پوری زندگی میں ان پر صرف کئے تھے، اب وہ سب برباد ہو چکے تھے اور درخت اوندھے گرے پڑے تھے''۔[4]

اس وقت وہ اپنی فضول باتوں اور بیہودہ سوچوں پر پشیمان ہوا، ''وہ کہتا تھا: کاش میں نے کسی کو اپنے پروردگار کا شریک نہ

---

[1] سورہ کہف آیت 39

[2] سورہ کہف آیت 39 تا 40

[3] سورہ کہف آیت 40

[4] سورہ کہف آیت 42

قرار دیا ہوتا، اے کاش میں نے شرک کی راہ پر قدم نہ رکھا ہوتا''۔[1]

زیادہ المناک پہلو یہ تھا کہ ان تمام مصائب والام کے سامنے وہ تن تنہا کھڑا تھا ''خدا کے علاوہ کوئی نہ تھا کہ جو اس مصیبت عظیم اور اتنے بڑے نقصان پر اس کی مدد کرتا''[2] اور چونکہ اس کا سارا سرمایہ تو یہی تھا جو برباد ہوگیا، اب اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ لہٰذا ''وہ خود بھی اپنی کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا''[3]

درحقیقت اس واقعے نے اس کے تمام غرور آمیز تصورات وخیالات کو زمین بوس اور باطل کردیا، کبھی تو وہ کہتا تھا کہ میں نہیں سمجھتا کہ یہ عظیم دولت وسرمایہ کبھی فنا ہوگا لیکن آج وہ اپنی آنکھوں سے اس کی تباہی دیکھ رہا تھا۔ دوسری طرف وہ اپنے خدا پرست اور باایمان دوست کے سامنے غرور وتکبر کا مظاہرہ کرتا تھا اور کہتا تھا کہ میں تجھ سے زیادہ قوی ہوں، میرے مددگار زیادہ ہیں لیکن اس واقعے کے بعد اس نے دیکھا کہ کوئی بھی اس کا مددگار نہیں ہے۔ اسے کبھی اپنی طاقت پر بڑا گھمنڈ تھا وہ سمجھتا تھا کہ اس کی بہت قوت ہے لیکن جب یہ واقعہ رونما ہوا اور اس نے دیکھا کہ کچھ بھی اس کے بس میں نہیں تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کیونکہ اب وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے بس میں اتنا بھی نہیں کہ وہ اس نقصان کے کچھ حصے کی بھی تلافی کرسکے۔

برصیصائے عابد

بنی اسرائیل میں ایک نامی گرامی عابد تھا جس کا نام ''برصیصا'' تھا۔[4]

جس نے طویل عرصہ تک عبادت پروردگار کی تھی جس کی وجہ سے وہ اس مقام پر پہنچ گیا تھا کہ جان بلب مریضوں کو اس کے پاس لاتے تھے اور اس کی دعا کے نتیجے میں انہیں دوبارہ صحت وسلامتی میسر ہوجاتی تھی ایک دن ایک معقول گھرانے کی عورت کو اس کے بھائی اس کے پاس لائے اور طے پایا کہ کچھ عرصہ تک وہ عورت وہیں رہے تاکہ اس کو شفا حاصل ہو۔

اب شیطان نے اس کے دل میں وسوسہ ڈالنے کا پروگرام بنایا اور اس قدر اس کو اپنے دام میں اسیر کیا کہ اس عابد نے عورت کے ساتھ زیادتی کی اور کچھ دنوں بعد یہ بات کھل گئی کہ وہ عورت حاملہ ہے (کیونکہ ہمیشہ ایک گناہ عظیم تر گناہوں کا سرچشمہ بنتا ہے) اس نے عورت کو قتل کردیا اور بیابان کے ایک گوشہ میں دفن کردیا، اس عورت کے بھائی اس واقعہ سے باخبر ہوئے کہ مرد عابد نے اس قسم کے ظلم عظیم کا اقدام کیا ہے۔

یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی، یہاں تک کہ امیر شہر کے کانوں تک جا پہنچی، وہ کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر چلا تاکہ حقیقت حال سے باخبر ہو، جس وقت وہ ظلم ثابت ہوگیا تو اس کو اس کی عبادت گاہ سے کھینچ کر باہر لے آئے، اقرار گناہ کے بعد حکم دیا گیا کہ اسے سولی پر چڑھا دیا جائے جس وقت وہ سولی پر چڑھا دیا جانے لگا تو شیطان اس کے سامنے نمودار ہوا اور کہا وہ میں تھا جس نے تجھے اس مصیبت میں پھنسایا، اب اگر جو کچھ میں کہوں وہ مان لے تو میں تیری نجات کا سامان فراہم کرتا ہوں، عابد نے کہا میں کیا کروں، اس نے کہا میرے لئے تیرا صرف ایک سجدہ کافی ہے۔

---

[1] سورہ کہف آیت 42

[2] سورہ کہف آیت 42

[3] سورہ کہف آیت 43

[4] سورہ کہف آیت 43

عابد نے کہا جس حالت میں تو مجھے دیکھ رہا ہے اس میں سجدہ کرنے کا کوئی امکان نہیں ہے، شیطان نے کہا: اشارہ ہی کافی ہے، عابد نے گوشہ چشم یا ہاتھ سے اشارہ کیا اور اس طرح شیطان کی بارگاہ میں سجدہ بجالایا اور اسی وقت مر گیا اور دنیا سے کافر گیا۔

انسانوں کو جلا دینے والی بھٹیاں

قرآن سورہ بروج میں فرماتا ہے: ''موت اور عذاب ہو تشدد کرنے والوں پر۔''

''وہی خندقیں جو آگ اور لکڑیوں سے پُر تھیں جن میں سے بڑے بڑے شعلے نکل رہے تھے''۔

''جس وقت وہ اس آگ کی خندق کے پاس بیٹھے ہوئے تھے (سرد مہری سے) اور جو کچھ وہ مومنین کے بارے میں انجام دے رہے تھے اسے دیکھ رہے تھے۔''[1]

''اخدود'' عظیم گڑھے اور خندق کے معنی میں ہے اور یہاں بڑی بڑی خندقیں مراد ہیں جو آگ سے پر تھیں تا کہ تشدد کرنے والے اس میں مومنین کو پھینک کر جلائیں۔

یہ واقعہ کس قوم سے متعلق ہے اور کس وقت معرض وجود میں آیا اور کیا یہ ایک خاص معین و مقرر واقعہ تھا، یا دنیا کے مختلف علاقوں کے اسی قسم کے متعدد واقعات کی طرف اشارہ ہے۔

مفسرین و مؤرخین کے درمیان اس موضوع پر اختلاف ہے سب سے زیادہ مشہور یہ ہے کہ یہ واقعہ سرزمین یمن کے ''قبیلہ حمیر'' کے ''ذونواس'' نامی بادشاہ کے دور کا ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ذونواس، جو حمیر نامی قبیلہ سے متعلق تھا یہودی ہو گیا اس کے ساتھ ہی اس کا پورا قبیلہ بھی یہودی ہو گیا، اس نے اپنا نام یوسفؑ رکھا، ایک عرصہ تک یہی صورت حال رہی، ایک وقت ایسا آیا کہ کسی نے اسے خبر دی کہ سرزمین نجران (یمن کا شمالی حصہ) میں ابھی تک ایک گروہ نصرانی مذہب پر قائم ہے ذونواس کے ہم مسلک لوگوں نے اسے اس بات پر ابھارا کہ اہل نجران کو دین یہود کے قبول کرنے پر مجبور کرے۔

وہ نجران کی طرف روانہ ہو گیا، وہاں پہنچ کر اس نے وہاں کے رہنے والوں کو اکٹھا کیا اور دین یہود ان کے سامنے پیش کیا اور ان سے اصرار کیا کہ وہ اس دین کو قبول کریں، لیکن انھوں نے انکار کیا اور شہادت قبول کرنے پر تیار ہو گئے، انھوں نے اپنے دین کو خیر باد نہ کہا، ذونواس اور اس کے ساتھیوں نے ایک گروہ کر پکڑ کر اسے آگ میں زندہ جلایا اور ایک گروہ کو تلوار کے گھاٹ اتارا، اس طرح آگ میں جلنے والوں اور مقتولین کی تعداد بیس ہزار تک پہنچ گئی۔

بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس سلسلہ دار و گیر سے بچ کر نصاری بنی نجران کا ایک آدمی قیصر روم کے دربار میں جا پہنچا، اس نے وہاں ذونواس کی شکایت کی اور اس سے مدد طلب کی، قیصر روم نے کہا تمہاری سرزمین مجھ سے دور ہے، میں بادشاہ حبشہ کو خط لکھتا ہوں جو عیسائی ہے اور تمہارا ہمسایہ ہے میں اس سے کہتا ہوں کہ وہ تمہاری مدد کرے۔

پھر اس نے خط لکھا اور حبشہ کے بادشاہ سے نصاری نجران کے عیسائیوں کے خون کا انتقام لینے کی خواہش کی، وہ نجرانی شخص بادشاہ حبشہ نجاشی کے پاس گیا، نجاشی اس سے یہ تمام ماجرا سن کر بہت متاثر ہوا اور سرزمین نجران میں شعلہ دین مسیح کے خاموش ہو جانے کا اسے بہت افسوس ہوا، اس نے ذونواس سے شہیدوں کے خون کا بدلہ لینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

---

[1] اس واقعہ کو بعض مفسرین نے سورہ حشر 16، 17 کے ذیل میں بیان کیا ہے

اس مقصد کے پیش نظر حبشہ کی فوج یمن کی طرف روانہ ہوئی اور ایک گھمسان جنگ کے نتیجے میں اس نے ذونواس کو شکست فاش دی اور ان میں سے بہت سے افراد کو قتل کیا، جلد ہی نجران کی حکومت نجاشی کے قبضہ میں آ گئی اور نجران حبشہ کا ایک صوبہ بن گیا۔

بعض مفسرین نے تحریر کیا ہے کہ اس خندق کا طول چالیس ذراع (ہاتھ) تھا اور اس کا عرض بارہ ذراع تھا،[1]

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ سات گڑھے تھے جن میں سے ہر ایک کی وسعت اتنی ہی تھی جتنی اوپر بیان ہوئی۔[2]

جو کچھ ہم نے تحریر کیا اس سے واضح ہوتا ہے کہ تشدد کرنے والے بے رحم افراد آخر کار عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے اور ان سے اس خون ناحق کا انتقام دنیا ہی میں لیا گیا اور عاقبت کا عذاب جہنم ابھی ان کے انتظار میں ہے۔

انسانوں کو جلانے والی یہ بھٹیاں جو یہودیوں کے ہاتھ سے معرض وجود میں ائیں، احتمال اس امر کا ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں یہ پہلی آدم سوز بھٹیاں تھیں لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اسی قسم کی قساوت اور بے رحمی کا خود یہودی بھی شکار ہوئے جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے بہت زیادہ لوگ ''ہٹلر'' کے حکم سے آدم سوز بھٹیوں میں جلائے گئے اور اس جہان میں بھی عذاب حریق کا شکار ہوئے۔

علاوہ ازیں ''ذونواس یہودی'' جو اس منحوس اقدام کا بانی تھا، وہ بھی بداعمالی کے انجام سے نہ بچ سکا، جو کچھ اصحاب اخدود کے بارے میں درج کیا گیا ہے یہ مشہور و معروف نظریات کے مطابق ہے۔[3]

بیٹیوں کو زندہ دفن کر دینا

بیٹیوں کا زندہ درگور کرنے کی داستان بڑی ہی دردناک ہے[4] ان واقعات پر نظر پڑے تو حالت غیر ہو جاتی ہے۔

ایک شخص پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے اسلام قبول کر لیا، سچا اسلام۔

ایک روز وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور سوال کیا: اگر میں نے کوئی بہت بڑا گناہ کیا ہو تو کیا میری توبہ قبول ہو سکتی

---

[1] سورۂ بروج آیت 4 تا 7

[2] ایک ذراع تقریباً آدھا میٹر ہے اور بعض اوقات گز کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جو تقریباً ایک میٹر ہے۔

[3] مندرجہ بالا واقعہ تاریخ و تفسیر کی بہت سی کتابوں میں درج ہے، منجملہ دیگر کتب کے عظیم مفسر طبرسی نے مجمع البیان میں، ابوالفتاح رازی نے اپنی تفسیر میں، فخر رازی نے اپنے تفسیر کبیر میں، الوسی نے روح المعانی میں اور قرطبی نے اپنی تفسیر میں اسی طرح ہشام نے اپنی سیرت (جلد اول ص 35) میں اور ایک دوسری جماعت نے اپنی کتب میں اس واقعہ کو تحریر کیا ہے۔

[4] لیکن اس ضمن میں کچھ اور روایات بھی موجود ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ اصحاب اخدود صرف یمن میں ذونواس ہی کے زمانے میں نہیں تھے۔

بعض مفسرین نے تو ان کے بارے میں دس قول نقل کئے ہیں۔

ایک روایت حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے منقول ہے، آپ نے فرمایا ہے ''وہ اہل کتاب مجوسی تھے جو اپنی کتاب پر عمل کرتے تھے، ان کے بادشاہوں میں سے ایک نے اپنی بہن سے مباشرت کی اور خواہش ظاہر کی کہ بہن سے شادی کو جائز قرار دے، لیکن لوگوں نے قبول نہیں کیا، بادشاہ نے ایسے بہت سے مومنین کو جنھوں نے یہ بات قبول نہیں کی تھی، جلتی ہوئی آگ کی خندق میں ڈلوا دیا۔''

یہ فارس کے اصحاب الاخدود کے بارے میں ہے، شام کے اصحاب الاخدود کے بارے میں بھی علماء نے لکھا ہے کہ وہاں مومنین رہتے تھے اور ''انتیا خوس'' نے انہیں خندق میں جلوایا تھا۔

بعض مفسرین نے اس وقعہ کو بنی اسرائیل کے مشہور پیغمبر حضرت دانیال علیہ السلام کے اصحاب و انصار کے ساتھ مربوط سمجھا ہے جس کی طرف توریت کی کتاب دانیال میں اشارہ ہوا ہے اور ثعلبی نے بھی اخدود فارسی کو انہی پر منطبق کیا ہے۔

کچھ بعید نہیں کہ اصحاب اخدود میں یہ سب کچھ اور ان جیسے دوسرے لوگ شامل ہوں اگرچہ اس کا مشہور معروف، مصداق سرزمین یمن کا ذونواس ہی ہے۔

ہے؟

آپؐ نے فرمایا: خدا توّاب ورحیم ہے۔

اس نے عرض کیا: یارسول اللہ میرا گناہ بہت ہی بڑا ہے۔

آپؐ نے فرمایا: وائے ہو تجھ پر، تیرا گناہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو خدا کی بخشش سے بڑا تو نہیں؟ وہ کہنے لگا: اب جب کہ آپ یہ کہتے ہیں تو میں عرض کروں: زمانہ جاہلیت میں میں ایک دور دراز کے سفر پر گیا ہوا تھا ان دنوں میری بیوی حاملہ تھی میں چار سال بعد گھر واپس لوٹا، میری بیوی نے میرا استقبال کیا میں گھر آیا تو مجھے ایک بچی نظر آئی میں نے پوچھا یہ کس کی لڑکی ہے؟ اس نے کہا: ایک ہمسایے کی لڑکی ہے، میں نے سوچا گھنٹے بھر تک اپنے گھر چلی جائے گی لیکن مجھے بڑا تعجب ہوا کہ وہ نہ گئی، مجھے علم نہ تھا کہ یہ میری لڑکی ہے اور اس کی ماں حقیقت کو چھپا رہی ہے کہ کہیں یہ میرے ہاتھوں قتل نہ ہو جائے۔

اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: آخر کار میں نے بیوی سے کہا: سچ بتاؤ یہ کس کی لڑکی ہے؟

بیوی نے جواب دیا: جب تم سفر پر گئے تھے تو میں امید سے تھی بعد میں یہ بیٹی پیدا ہوئی، یہ تمہاری ہی بیٹی ہے۔

اس شخص نے مزید کہا: میں نے وہ رات بڑی پریشانی کے عالم میں گزاری کبھی آنکھ لگ جاتی اور کبھی میں بیدار ہو جاتا، صبح قریب تھی، میں بستر سے نکلا، لڑکی کے بستر کے پاس گیا وہ اپنی ماں کے پاس سو رہی تھی، میں نے اسے بستر سے نکالا، اسے جگایا، اس سے کہا: میرے ساتھ نخلستان کی طرف چلو۔

اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: وہ میرے پیچھے پیچھے چل رہی تھی یہاں تک کہ ہم نخلستان میں پہنچ گئے میں نے گڑھا کھودنا شروع کیا وہ میری مدد کر رہی تھی میرے ساتھ مل کر مٹی باہر پھینکتی تھی گڑھا مکمل ہو گیا میں نے اسے بغل کے نیچے سے پکڑ کر اس گڑھے کے درمیان دے مارا۔

اتنا سننا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھیں بھر آئیں۔

اس نے مزید بتایا: میں نے اپنا بایاں ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا تا کہ وہ باہر نہ نکل سکے دائیں ہاتھ سے میں اس پر مٹی ڈالنے لگا اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، بڑی مظلومانہ فریاد کی؛ وہ کہتی تھی ابو جان آپ مجھ سے یہ سلوک کر رہے ہیں؟

اس نے بتایا: میں اس پر مٹی ڈال رہا تھا کہ کچھ مٹی میری داڑھی پر آ پڑی بیٹی نے ہاتھ بڑھایا اور میرے چہرے سے مٹی صاف کی لیکن میں اسی قساوت اور سنگدلی سے اس کے منہ پر مٹی ڈالتا رہا یہاں تک کہ اس کے نالہ وفریاد کی آخری آواز بہ خاک دم توڑ گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے داستان بڑے غم کے عالم میں سنی، وہ بہت دکھی اور پریشان تھے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے جا رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر رحمت خدا کو اس کے غضب پر سبقت نہ ہوتی تو ضروری تھا کہ جتنا جلدی ہوتا وہ تجھ سے انتقام لیتا[1]۔

میں نے اپنی بارہ بیٹیوں کو زندہ درگور کیا ہے

''قیس بن عاصم'' ابن تمیم کے سرداروں میں سے تھا، ظہور رسالت ماب کے بعد وہ اسلام لے آیا تھا اس کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک روز وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا وہ چاہتا تھا کہ جو سنگین بوجھ وہ اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتا ہے اسے

---

[1] سورہ نحل آیت 58و59

کچھ ہلکا کرے، اس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا:

گزشتہ زمانے میں بعض باپ ایسے بھی تھے جنھوں نے جہالت کے باعث اپنی بے گناہ بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیا تھا میری بھی بارہ بیٹیاں ہوئیں میں نے سب کے ساتھ یہ گھناؤنا سلوک کیا لیکن جب میرے یہاں تیرہویں بیٹی ہوئی بیوی نے اسے مخفی طور پر جنم دیا اس نے یہ ظاہر کیا کہ نومولود مردہ پیدا ہوئی ہے، لیکن اسے چھپ چھپا کر اپنے قبیلے والوں کے یہاں بھیج دیا اس وقت تو میں مطمئن ہو گیا لیکن بعد میں مجھے اس ماجرے کا علم ہو گیا میں نے اسے حاصل کیا اور اپنے ساتھ ایک جگہ لے گیا

اس نے بہت آہ وزاری کی، میری منتیں کیں، گریہ وبکا کی مگر میں نے پرواہ نہ کی اور اسے زندہ درگور کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ واقعہ سنا تو بہت ناراحت ہوئے، آپؐ کی آنکھوں سے انسو جاری تھے کہ آپ نے فرمایا: جو کسی پر رحم نہیں کھاتا اس پر رحم نہیں کھایا جائے گا۔

اس کے بعد آپؐ نے قیس کی طرف رخ کیا اور یوں گویا ہوئے: تمہیں سخت ترین دن درپیش ہے۔

قیس نے عرض کیا: میں کیا کروں کہ اس گناہ کا بوجھ میرے کندھے سے ہلکا ہو جائے؟

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تو نے جتنی بیٹیوں کو قتل کیا ہے اتنے غلام آزاد کر (کہ شاید تیرے گناہ کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔)

نیز مشہور شاعر فرزدق کے دادا ''صعصعہ بن ناجیۃ'' کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ حریت فکر رکھنے والا ایک شریف انسان تھا زمانہ جاہلیت میں وہ لوگوں کی بہت سی بری عادات کے خلاف جدوجہد کرتا تھا یہاں تک کہ اس نے 360 لڑکیاں ان کے والدوں سے خرید کر انہیں موت سے نجات بخشی، ایک مرتبہ اس نے دیکھا کہ ایک باپ اپنی نومولود بیٹی کو قتل کرنے کا مصمم ارادہ کر چکا ہے، اس بچی کی نجات کے لئے اس نے اپنی سواری کا گھوڑا تک اور دو اونٹ اس کے باپ کو دے دیئے اور اس بچی کو نجات دلائی

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تو نے بہت ہی بڑا کام انجام دیا ہے اور تیری جزا اللہ کے یہاں محفوظ ہے۔[1]

اصحاب فیل

مفسرین اور مؤرخین نے اس داستان کو مختلف صورتوں میں نقل کیا ہے اور اس کے وقوع کے سال میں بھی اختلاف ہے لیکن اصل داستان ایسی مشہور ہے کہ یہ اخبار متواتر میں شمار ہوتی ہے اور ہم اسے مشہور روایات کے مطابق ''سیرۃ ابن ہشام'' و ''بلوغ الارب'' و ''بحار الانوار'' اور ''مجمع البیان'' سے خلاصہ کر کے نقل کرتے ہیں۔

یمن کے بادشاہ ''ذونواس'' نے نجران کے عیسائیوں کو جو اس سرزمین کے نزدیک بستے تھے، اس لئے بہت تنگ کر رکھا تھا کہ وہ اپنا دین مسیحیت چھوڑ دیں۔ (قرآن نے اس واقعہ کو سورہ ''بروج'' میں ''اصحاب الاخدود'' کے عنوان سے بیان کیا ہے۔)

اس عظیم جرم کے بعد ''دوس'' نامی ایک شخص ان میں سے اپنی جان بچا کر نکل گیا اور وہ قیصر روم کے پاس، جو مسیحیت پر تھا جا پہنچا اور اس کے سامنے یہ سارا ماجرا بیان کیا۔

چونکہ ''روم'' اور ''یمن'' کے درمیان فاصلہ زیادہ تھا لہٰذا اس نے حبشہ کے بادشاہ ''نجاشی'' کو خط لکھا کہ وہ ''ذونواس'' سے

---

[1] فرزدق نے اپنے دادا کے اس کام پر فخر کرتے ہوئے کہا؛

ترجمہ شعر: ''اور وہ شخص ہمارے خاندان سے تھا جس نے بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے کے خلاف قیام کیا، اس نے لڑکیوں کو لے لیا اور انہیں زندگی عطا کی اور انہیں تہہ خاک دفن نہ ہونے دیا۔''

نصارائے نجران کا انتقام لے،اوراس خط کواسی شخص کے ہاتھ ''نجاشی'' کے پاس روانہ کیا۔

''نجاشی'' نے ایک بہت بڑالشکر جوستر ہزار افراد سے زیادہ پر مشتمل تھا''ار یاط'' نامی شخص کے کمان میں یمن کی طرف روانہ کیا۔''ابرہہ'' بھی اس لشکر کے افسروں میں سے ایک تھا۔

''ذونواس'' کوشکست ہوئی،اور''ار یاط'' یمن کا حکمران ہوگیا۔کچھ مدت کے بعد''ابرہہ'' نے ار یاط کے خلاف بغاوت کردی اوراس کا خاتمہ کرنے کے بعداس کی جگہ پر بیٹھ گیا۔

اس واقعہ کی خبرنجاشی کو پہنچی تو اس نے''ابرہہ'' کی سرکوبی کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ابرہہ نے اپنی نجات کے لئے اپنے سر کے بال منڈوا کریمن کی کچھ مٹی کے ساتھ مکمل تسلیم کی نشانی کے طور پرنجاشی کے پاس بھیج دیئے،اوروفاداری کا اعلان کیا۔نجاشی نے جب یہ دیکھا تو ابرہہ کومعاف کردیا،اوراسے اس کے منصب پر برقرار رکھا۔

ابرہہ نے بہت بڑا گرجا گھر تعمیر کرایا

اس موقع پر''ابرہہ'' نے اپنے حسن خدمت کوثابت کرنے کے لئے ایک اہم اور بہت ہی خوبصورت گرجا گھر تعمیر کرایا۔جس کی اس زمانے میں کرہ ارض پر کوئی مثل ونظیر نہ تھی۔اوراس کے بعد جزیرہ عرب کے لوگوں کو خانہ کعبہ کے بجائے اس گرجے کی طرف دعوت دینے کا مصمم ارادہ کرلیا،اور یہ پختہ ارادہ کرلیا کہ اس جگہ کوعرب کے حج کا مرکز بنا کر مکہ کی اہم مرکزیت کو وہاں منتقل کردے۔

اس مقصد کے لئے اس نے ہرطرف عرب کے قبائل اور سرزمین حجاز میں بہت سے مبلغ بھیجے۔عربوں نے،جومکہ اور کعبہ کے ساتھ شدید لگاؤ رکھتے تھے اوراسے ابراہیم علیہ السلام کے آثار میں سے جانتے تھے،اس سے خطرہ محسوس کیا۔بعض روایات کے مطابق ایک گروہ نے وہاں جاکر مخفی طور پر اس گرجے کو آگ لگادی،اور دوسری روایت کے مطابق بعض نے اسے مخفی طور پر گندہ اور ملوث کردیا۔اوراس طرح سے انہوں نے اس عظیم دعوت کے مقابلہ میں شدید ردعمل کا مظاہرہ کیا،اور''ابرہہ'' کے عبادت خانے کو بے اعتبار اور حقیر بنادیا۔

ابرہہ حملہ کے لئے تیار

ظاہر ہے اس پر''ابرہہ'' کو بہت غصہ آیا اوراس نے خانہ کعبہ کوکلی طور پر ویران کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا۔اس کا خیال تھا اس طرح وہ انتقام بھی لے لے گا اور عربوں کو نئے معبد کی طرف متوجہ بھی کردے گا۔چنانچہ وہ ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ،جن میں سے کچھ لوگ ہاتھیوں پر سوار تھے،مکہ کی طرف روانہ ہوا۔

جب وہ مکہ کے قریب پہنچا تو اس نے کچھ لوگوں کو مکہ والوں کے اونٹ اور دوسرے اموال لوٹنے کے لئے بھیجا۔ان میں سے دوسواونٹ عبدالمطلب علیہ السلام کے بھی لوٹ لئے گئے۔

''ابرہہ'' نے کسی آدمی کو مکہ کے اندر بھیجا اوراس سے کہا کہ رئیس مکہ کوتلاش کرکے اس سے کہنا کہ''ابرہہ'' یمن کا بادشاہ کہتا ہے کہ:میں جنگ کرنے کے لئے نہیں آیا۔میں تو صرف اس لئے آیا ہوں کہ اس خانہ کعبہ کو ویران کردوں۔اگر تم جنگ نہ کروتو مجھے تمہارا خون بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔

میں اونٹوں کا مالک ہوں

''ابرہہ'' کا قاصد مکہ میں داخل ہوا اور رئیس وشریف مکہ کے بارے میں دریافت کیا۔سب نے''عبدالمطلب علیہ السلام'' کی

طرف راہنمائی کی۔اس نے عبدالمطلب علیہ السلام کے سامنے ماجرا بیان کیا۔عبدالمطلب علیہ السلام نے بھی یہی جواب دیا کہ ہم میں تم سے جنگ کرنے کی طاقت نہیں ہے، رہا خانہ کعبہ تو خدا خود اس کی حفاظت کرے گا۔

''ابرہہ'' کے قاصد نے عبدالمطلب علیہ السلام سے کہا کہ تمہیں میرے ساتھ اس کے پاس چلنا پڑے گا۔جب عبدالمطلب علیہ السلام اس کے دربار میں داخل ہوئے تو وہ آپؑ کے بلند قد، حسین چہرے اور حد سے زیادہ رعب اور دبدبہ کو دیکھ کر سخت متاثر ہوا، یہاں تک کہ ''ابرہہ'' ان کے احترام میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور زمین پر بیٹھ گیا اور عبدالمطلب علیہ السلام کو اپنے پہلو میں بٹھایا، کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ انہیں اپنے ساتھ تخت پر بٹھائے۔اس کے بعد اس نے اپنے مترجم سے کہا کہ ان سے پوچھ کہ ان کی کیا حاجت ہے؟

آپؑ نے مترجم سے کہا: میری حاجت یہ ہے کہ میرے دوسو اونٹ تیرے لشکری لوٹ کر لے گئے ہیں، تو انہیں حکم دے کہ وہ میرا مال واپس کر دیں۔

''ابرہہ'' کو ان کے اس مطالبہ پر سخت تعجب ہوا اور اس نے اپنے مترجم سے کہا: ان سے کہو: جب میں نے تمہیں دیکھا تھا، تو میرے دل میں تمہاری بہت زیادہ عظمت پیدا ہوئی تھی، لیکن جب تم نے یہ بات کہی تو میری نظر میں تمہاری توقیر گھٹ گئی۔تم اپنے دوسو اونٹوں کے بارے میں تو بات کرتے ہو لیکن ''کعبہ'' کے بارے میں جو تمہارا اور تمہارے آباؤ واجداد کا دین ہے، اور میں اسے ویران کرنے کے لئے آیا ہوں، بالکل کوئی بات نہیں کرتے۔

عبدالمطلب علیہ السلام نے کہا: "انا رب الابل، وان للبیت رباً سیمنعه"۔

''میں اونٹوں کا مالک ہوں، اور اس گھر کا بھی ایک مالک ہے، وہ اس کی حفاظت خود کرے گا۔'' (اس بات نے ابرہہ کو ہلا کر رکھ دیا اور وہ سوچ میں پڑ گیا)۔

عبدالمطلب علیہ السلام مکہ کی طرف آئے، اور لوگوں کو اطلاع دی کہ وہ پہاڑوں میں پناہ گزیں ہو جائیں۔اور آپؑ خود ایک گروہ کے ساتھ خانہ کعبہ کے پاس آئے تا کہ دعا کریں اور مدد طلب کریں۔آپؑ نے خانہ کعبہ کے دروازے کی زنجیر میں ہاتھ ڈال کر مشہور اشعار پڑھے جن کا ترجمہ یہ ہے:

''خدایا ہر شخص اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے تو اپنے گھر کی حفاظت فرما۔''

''ایسا کبھی نہ ہو کہ کسی دن ان کی صلیب اور ان کی قدرت تیری قدرتوں پر غلبہ حاصل کرے''۔

''اور اپنے شہروں کی تمام توانائیاں اور ہاتھی ساتھ لے کر آئے ہیں تا کہ تیرے حرم کے ساکنوں کو قیدی بنالیں''۔

لاهم ان المرء يمنع رحله فامنع رحالك
لايغلبن صليبهم و محالهم ابداً محالك
جروا جميع بلادهم والفيل كى يبسوا عيالك
لاهم ان المرء يمنع رحله فامنع عيالك
والنصر على ال الصليب و عابديه اليوما لك

ترجمہ:

خدایا ہر شخص اپنے گھر والوں کا دفاع کرتا ہے تو بھی اپنے حرم امن کے رہنے والوں کا

دفاع کر، اور آج اس حرم کے رہنے والوں کی آل صلیب اور اس کی عبادت کرنے
والوں کے برخلاف مدد فرما۔

اس کے بعد عبدالمطلب علیہ السلام اطراف مکہ کے ایک درہ کی طرف آئے، قریش کی ایک جماعت کے ساتھ وہاں پناہ لی اور اپنے ایک بیٹے کو حکم دیا کہ وہ کوہ ''ابوقبیس'' کے اوپر جا کر دیکھے کہ کیا ہو رہا ہے۔

آپ کا بیٹا بڑی تیزی کے ساتھ آپؑ کے پاس آیا اور کہا: بابا جان سمندر (دریائے احمر) کی طرف سے ایک سیاہ بادل آتا ہوا نظر آ رہا ہے عبدالمطلب علیہ السلام خوش ہو گئے اور پکار کر کہا:

''اے جمعیت قریش اپنے گھروں کی طرف پلٹ جاؤ کیونکہ خدا کی نصرت تمہاری مدد کے لئے آ رہی ہے''۔ یہ تو اس طرف کی بات تھی۔

دوسری طرف سے ابرہہ اپنے مشہور ہاتھی پر سوار ہوا جس کا نام ''محمود'' تھا اس نے کثیر لشکر کے ساتھ کعبہ کو تباہ کرنے کے لئے اطراف کے پہاڑوں سے مکہ کی طرف اترا، لیکن وہ اپنے ہاتھی پر جتنا دباؤ ڈالتا تھا وہ آگے نہ بڑھتا تھا، لیکن جب وہ اس کا رخ یمن کی طرف کرتا تھا تو وہ فوراً چل پڑتا تھا۔ ابرہہ اس واقعہ سے سخت متعجب ہوا اور حیرت میں ڈوب گیا۔

اسی اثناء میں سمندر کی طرف سے غول کے غول اور جھنڈ کے جھنڈ، چھوٹے چھوٹے پرندوں کے آن پہنچے، جن میں سے ہر ایک کے پاس تین تین کنکریاں تھیں، ایک ایک چونچ میں اور دو دو پنجوں میں، جو تقریباً چنے کے دانے کے برابر تھیں۔ انہوں نے یہ کنکریاں ابرہہ کے لشکر پر برسانی شروع کر دیں۔ یہ کنکریاں جس کسی کو لگتیں وہ ہلاک ہو جاتا۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ کنکریاں ان کے بدن پر جہاں بھی لگتی سوراخ کر دیتی تھیں، اور دوسری طرف نکل جاتی تھیں۔

اس وقت ابرہہ کے لشکر پر ایک عجیب و غریب وحشت طاری ہو گئی۔ جو زندہ بچے وہ بھاگ کھڑے ہوئے، اور واپسی کے لئے یمن کی راہ پوچھتے تھے، لیکن مسلسل خزاں کے پتوں کی طرح سڑک کے بیچوں بیچ گر جاتے تھے۔

ایک پتھر خود ''ابرہہ'' کے آ کر لگا اور وہ زخمی ہو گیا۔ اس کو صنعا (یمن کے پائے تخت) کی طرف واپس لے گئے اور وہ وہاں جا کر ہلاک ہو گیا۔

بعض نے کہا ہے کہ چیچک کی بیماری پہلی مرتبہ عرب میں اسی سال پھیلی تھی۔

ہاتھیوں کی تعداد جو ابرہہ اپنے ساتھ لے گیا تھا، بعض نے وہی ''محمود'' ہاتھی، بعض نے آٹھ، بعض نے دس اور بعض نے بارہ لکھی ہے۔

مشہور قول کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت اسی سال ہوئی اور عالم آپؐ کے نور وجود سے منور ہو گیا۔ لہٰذا بہت سے لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ان دونوں واقعات کے درمیان ایک رابطہ موجود تھا۔

بہر حال اس عظیم حادثہ کی اس قدر اہمیت تھی کہ اس سال کا نام ''عام الفیل'' (ہاتھی کا سال) رکھا گیا اور یہ عربوں کی تاریخ کا مبداء قرار پایا۔

ایک بے نظیر معجزہ (اس گھر کا ایک مالک ہے)

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے اس مفصل و طولانی داستان کو چند مختصر اور چبھنے والے انتہائی فصیح و بلیغ جملوں

میں بیان کر دیا ہے اور حقیقتاً ایسے نکات بیان کئے ہیں جو قرآنی اہداف، یعنی مغرور سرکشوں کو بیدار کرنے اور خدا کی عظیم قدرت کے مقابلہ میں انسان کی کمزوری دکھانے میں مدد دیتے ہیں۔

یہ ماجرا اس بات کی نشانی دہی کرتا ہے کہ معجزات وخوارق عادات، بعض لوگوں کے خیال کے برخلاف، لازمی نہیں ہے کہ پیغمبر یا امام ہی کے ہاتھ پر ظاہر ہوں۔ بلکہ جن حالات میں خدا چاہے اور ضروری سمجھے انجام پا جاتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ خدا کی عظمت اور اس کے دین کی حقانیت سے آشنا ہو جائیں۔

یہ عجیب وغریب اعجاز آمیز اور عذاب دوسری سرکش اقوام کے عذاب کے ساتھ ایک واضح فرق رکھتا ہے کیونکہ طوفان نوح علیہ السلام کا عذاب، اور قوم لوط علیہ السلام کا زلزلہ اور سنگ باری، قوم عاد کی تیز آندھی اور قوم ثمود کا صاعقہ طبعی حوادث کا ایک سلسلہ تھے، کہ جن کا صرف ان خاص حالات میں وقوع معجزہ تھا۔

لیکن لشکر ابرہہ کی نابودی کی داستان ان سنگریزوں کے ذریعے جو چھوٹے چھوٹے پرندوں کی چونچ اور پنجوں سے گرتے تھے۔ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو طبعی حوادث سے مشابہ ہو۔

ان چھوٹے چھوٹے پرندوں کا اٹھنا، اسی خاص لشکر کی طرف آنا، اپنے ساتھ کنکریوں کا لانا، خاص طور سے انہی کو نشانہ بنانا اور ان چھوٹی چھوٹی کنکریوں سے ایک عظیم لشکر کے افراد کے اجسام کا ریزہ ریزہ ہو جانا، یہ سب کے سب خارق العادۃ امور ہیں، لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ خدا کی قدرت کے سامنے بہت ہی معمولی چیز ہے۔

وہی خدا جس نے انہی سنگ ریزوں کے اندر ایٹم کی قدرت پیدا کی ہے کہ اگر وہ آزاد ہو جائیں تو ایک عظیم تباہی پھیلا دیں۔ اس کے لئے یہ بات آسان ہے کہ ان کے اندر ایسی خاصیت پیدا کر دے کہ ابرہہ کے لشکر کے جسموں کو "عصف ما کول" (کھائے ہوئے بھوسے کی مانند) بنا دے۔

ہمیں بعض مصری مفسرین کی طرح اس حادثہ کی توجیہہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ ان کنکریوں میں وبا یا چیچک کے جراثیم تھے۔ اور اگر بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ صدمہ زدہ لوگوں کے بدنوں سے چیچک میں مبتلا افراد کی طرح خون اور پیپ آتی تھی، تو یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ حتمی طور پر چیچک میں مبتلا تھے۔ اسی طرح سے ہمیں اس بات کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ یہ سنگ ریزے پسے ہوئے ایٹم تھے جن کے درمیان کی ہوا ختم ہو گئی تھی، اور وہ حد سے زیادہ سخت تھے، اس طرح سے کہ وہ جہاں بھی گرتے تھے سوراخ کر دیتے تھے۔

یہ سب کی سب ایسی توجیہات ہیں جو اس حادثہ کو طبعی بنانے کے لئے ذکر ہوئی ہیں اور ہم اس کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں کہ ان سنگ ریزوں میں ایسی عجیب وغریب خاصیت تھی جو جسموں کو ریزہ ریزہ کر دیتی تھی۔ اس سے زیادہ اور کوئی اطلاع ہمارے پاس نہیں ہے۔ بہر حال خدا کی قدرت کے مقابلہ میں کوئی کام بھی مشکل نہیں ہوتا۔

ایک مسلم تاریخی روئیداد

قابل توجہ بات یہ ہے کہ "اصحاب فیل" کا ماجرا عربوں کے درمیان ایسا مسلم تھا کہ یہ ان کے لئے تاریخ کا آغاز قرار پایا اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، قرآن مجید نے ایک نہایت ہی عمدہ تعبیر "الم تر" (کیا تو نے نہیں دیکھا) کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے جو نہ تو اس زمانہ میں موجود تھے اور نہ ہی سے دیکھا تھا، جو اس ماجرے کے مسلم ہونے کی

ایک اور نشانی ہے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکین مکہ کے سامنے ان آیات کی تلاوت کی تو کسی نے اس کا انکا رنہ کیا۔ اگر یہ مطلب مشکوک ہوتا تو کم از کم کوئی اعتراض کرتا اور ان کا اعتراض ان کے باقی اعتراضوں کی طرح ہی تاریخ میں ثبت ہوجاتا۔

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نبوت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس دین پر تھے؟

اس بات میں تو شک کی گنجائش ہی نہیں کہ بعثت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ تو کسی بت کو سجدہ کیا اور نہ ہی توحید کی راہ سے سرمو انحراف کیا، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس دین پر پابند تھے؟ تو اس بارے میں علماء کی آراء مختلف ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ آپؐ دین مسیح علیہ السلام پر تھے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے جو مستقل، قانونی اور غیر منسوخ دین تھا وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دین ہی تھا۔

بعض علماء آپؐ کو دین ابراہیمی پر پابند سمجھتے ہیں۔ کیونکہ جناب ابراہیم علیہ السلام شیخ الانبیاء اور ابوالانبیاء تھے اور قرآن کی بعض آیات میں بھی دین اسلام کا دین ابراہیم علیہ السلام کے نام سے تعارف کروایا گیا ہے۔[1]

بعض علماء نے اس بارے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ یقیناً آپؐ کسی دین پر تو پابند تھے لیکن یہ نہیں معلوم کہ وہ کونسا دین تھا؟

اگرچہ ان احتمالات میں سے ہر ایک کی اپنی جگہ پر دلیل تو ہے لیکن مسلم کوئی بھی نہیں۔ البتہ ان تینوں اقوال سے ہٹ کر ایک چوتھا احتمال زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خداوند عالم کی طرف سے اپنے لئے ایک خاص پروگرام رکھتے تھے، اور اسی پر عمل پیرا تھے اور درحقیقت یہ آپؐ کی ذات کے لیے مخصوص ایک دین تھا، جب تک کہ اسلام نازل نہیں ہوگیا''۔

اس قول پر وہ حدیث شاہد ہے جو نہج البلاغہ میں موجود ہے: ''جس وقت سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دودھ بڑھائی ہوئی، اللہ نے اپنے فرشتوں میں سے ایک عظیم فرشتے کو آپؐ کے ساتھ ملا دیا، جو شب و روز مکارم الاخلاق اور نیک راستوں پر آپؐ کو اپنے ساتھ رکھتا''۔

اس قول کا ایک اور گواہ یہ ہے کہ کسی بھی تاریخ میں نہیں ملتا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہود یا نصاریٰ یا کسی اور مذہب کے عبادت خانوں میں عبادت کے لیے تشریف لے گئے ہوں، نہ تو کفار کے ساتھ مل کر کبھی کسی بت خانے میں گئے اور نہ ہی اہل کتاب کے ساتھ کسی عبادت خانے میں بلکہ ہمیشہ راہ توحید پر گامزن رہے اور آپؐ اخلاقی اصولوں اور عبادت الٰہی کے سخت پابند تھے۔

بحار الانوار میں علامہ مجلسی کے مطابق، بہت سی اسلامی روایات اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی عمر کے آغاز ہی سے روح القدس کے ساتھ موید تھے اور اس تائید کے ساتھ یقیناً وہ روح القدس کی راہنمائی کے مطابق عمل کیا کرتے تھے۔

علامہ مجلسی ذاتی طور پر اس بات کے معتقد ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رسالت کے مرتبے پر فائز ہونے سے پہلے مقام نبوت پر فائز تھے، اور کبھی آپؐ ان کی آواز سنا کرتے تھے اور کبھی سچے خواب کی صورت میں آپؐ پر خدائی الہام ہوا کرتا تھا۔ چالیس سال

---

[1] "ملة ابیکم ابراھیم" (سورہ حج آیت 78)

کے بعد اعلان رسالت کا حکم ہوا اور اسلام و قرآن با قاعدہ طور پر آپؐ پر نازل ہوئے۔

علامہ مجلسی نے اپنے اس مدعا پر چھ دلائل ذکر کئے ہیں جن میں سے کچھ ان دلائل کے ساتھ ملتے جلتے اور ہم آہنگ ہیں جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

آغاز وحی

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوہ حرا پر گئے ہوئے تھے کہ جبرائیل آئے اور کہا: اے محمد پڑھ: پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ جبرائیل نے انہیں آغوش میں لے کر دبایا اور پھر دوبارہ کہا: پڑھ، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر اسی جواب کو دہرایا۔ اس کے بعد جبرائیل نے پھر وہی کام کیا اور وہی جواب سنا، اور تیسری بار کہا: (اقرا باسم ربك الذی خلق) [1]

جبرائیل علیہ السلام یہ بات کہہ کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظروں سے غائب ہو گئے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو وحی کی پہلی شعاع کو حاصل کرنے کے بعد بہت تھکے ہوئے تھے خدیجہ سلام اللہ علیہا کے پاس آئے اور فرمایا: ''زملونی ودثرونی'' مجھے اڑھا دو اور کوئی کپڑا میرے اوپر ڈال دو تا کہ میں آرام کروں۔

''علامہ طبرسی'' بھی مجمع البیان میں یہ نقل کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدیجہ سے فرمایا: ''جب میں تنہا ہوتا ہوں تو ایک آواز سن کر پریشان ہو جاتا ہوں''۔

حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا نے عرض کیا: خدا آپ کے بارے میں خیر اور بھلائی کے سوا کچھ نہیں کرے گا کیونکہ خدا کی قسم آپ امانت کو ادا کرتے ہیں اور صلہ رحم بجالاتے ہیں اور جو بات کرتے ہیں اس میں سچ بولتے ہیں۔

''خدیجہ'' سلام اللہ علیہا کہتی ہیں: اس واقعہ کے بعد ہم ورقہ بن نوفل کے پاس گئے (نوفل حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کا زاد بھائی اور عرب کے علماء میں سے تھا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا وہ ''ورقہ'' سے بیان کیا ''ورقہ'' نے کہا: جس وقت وہ پکارنے والا آپ کے پاس آئے تو غور سے سنو کہ وہ کیا کہتا ہے؟ اس کے بعد مجھ سے بیان کرنا۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی خلوت گاہ میں سنا کہ وہ کہہ رہا ہے: اے محمد کہو:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ①
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ② الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ③ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ④ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ⑤
اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ⑥ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ⑦

اور کہو ''لا الہ الا اللہ'' اس کے بعد آپ ورقہ کے پاس آئے اور اس ماجرے کو بیان کیا۔

ورقہ نے کہا: ''آپ کو بشارت ہو پھر بھی آپ کو بشارت ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ وہی ہیں جن کی عیسیٰ بن مریم نے بشارت دی ہے آپ موسیٰ علیہ السلام کی طرح صاحب شریعت ہیں اور پیغمبر مرسل ہیں۔ آج کے بعد بہت جلد ہی جہاد کے لیے مامور ہوں گے اور اگر میں اس دن تک زندہ رہا تو آپ کے ساتھ مل کر جہاد کروں گا''۔

جب ورقہ دنیا سے رخصت ہو گیا تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے اس روحانی شخص کو بہشت (برزخی جنت) میں

---

[1] سورہ علق آیت 1

دیکھا ہے کہ وہ جسم پر ریشمی لباس پہنے ہوئے تھا کیونکہ وہ مجھ پر ایمان لایا تھا اور میری تصدیق کی تھی''۔ [1]

پہلا مسلمان [2]

اس سوال کے جواب میں سب نے متفقہ طور پر کہا ہے کہ عورتوں میں سے جو خاتون سب سے پہلے مسلمان ہوئیں وہ جناب خدیجہ سلام اللہ علیہا تھیں جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفادار اور فداکار زوجہ تھیں باقی رہا مردوں میں سے تو تمام شیعہ علماء ومفسرین اور اہل سنت علماء کے ایک بہت بڑے گروہ نے کہا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے مردوں میں سے دعوت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر لبیک کہی علماء اہل سنت میں اس امر کی اتنی شہرت ہے کہ ان میں سے ایک جماعت نے اس پر اجماع واتفاق کا دعویٰ کیا ہے ان میں سے حاکم نیشاپوری [3] نے کہا ہے:

مؤرخین میں اس امر پر کوئی اختلاف نہیں کہ علی ابن ابی طالب علیہما السلام اسلام لانے والے پہلے شخص ہیں۔ اختلاف اسلام قبول کرتے وقت ان کے بلوغ کے بارے میں ہے۔

جناب ابن عبدالبر (3) لکھتے ہیں: اس مسئلہ پر اتفاق ہے کہ خدیجہ سلام اللہ علیہا وہ پہلی خاتون ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائیں اور جو کچھ وہ لائے تھے اسی کی تصدیق کی۔ پھر حضرت علی علیہ السلام نے ان کے بعد یہی کام انجام دیا۔ [4]

ابوجعفر الکافی معتزلی لکھتا ہے: تمام لوگوں نے یہی نقل کیا ہے کہ سبقت اسلام کا افتخار علی سے مخصوص ہے۔ [5] قطع نظر اس کے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے، خود حضرت علی علیہ السلام سے اور صحابہ سے اس بارے میں بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں جو حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں، ذیل میں چند روایات ہم نمونے کے طور پر نقل کرتے ہیں: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

1۔ پہلا شخص جو حوض کوثر کے کنارے میرے پاس پہنچے گا وہ شخص ہے جو سب سے پہلے اسلام لایا اور وہ علی بن ابی طالب ہے۔ [6]

2۔ علماء اہل سنت کے ایک گروہ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے حضرت علی علیہ السلام کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: یہ پہلا شخص ہے جو مجھ پر ایمان لایا اور پہلا شخص ہے جو قیامت میں مجھ سے مصافحہ کرے گا اور یہ ''صدیق اکبر'' ہے۔ [7]

---

[1] (2) یقینی طور پر مفسرین کے بعض کلمات یا تاریخ کی کتابوں میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کی اس فصل کے بارے میں ایسے ناموزوں مطالب نظر آتے ہیں جو مسلمہ طور پر جعلی وضعی گھڑی ہوئی روایات اور اسرائیلیات سے ہیں مثلاً یہ کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نزول وحی کے پہلے واقعہ کے بعد بہت ہی ناراحت ہوئے اور ڈر گئے کہ کہیں یہ شیطانی القا آت نہ ہوں یا آپ نے کئی مرتبہ اس بات کا پختہ ارادہ کر لیا کہ خود کو پہاڑ سے گرا دیں اور اسی قسم کے فضول اور بے ہودہ باتیں جو نہ تو نبوت کے بلند مقام کے ساتھ سازگار ہیں اور نہ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس عقل اور حد سے زیادہ دانش مندی مدبریت صبر وتحمل وشکیبائی نفس پر تسلط اور اس اعتماد کو ظاہر کرتی ہیں جو تاریخوں میں ثبت ہے۔

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ اس قسم کی ضعیف ورکیک روایات دشمنان اسلام کی ساختہ وپرداختہ ہیں جن کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کو بھی مورد اعتراض قرار دے دیں اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی کو بھی۔

[2] اس سوال کو اکثر مفسرین نے سورہ توبہ آیت 100 ''السابقون الاولون'' کے ضمن میں بیان کیا ہے۔

[3] مستدرک علی صحیحین کتاب معرفت ص22

[4] استیعاب، ج2 ص457

[5] الغدیر ج3، ص237

[6] الغدیر ج3، ص237

[7] الغدیر میں یہ حدیث مستدرک حاکم ج2 ص136، استیعاب ج2 ص457 اور شرح ابن ابی الحدید ج3 ص258 سے نقل کی گئی ہے۔

3۔ابوسعید خدری رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کے دونوں شانوں کے درمیان ہاتھ مار کر فرمایا: ''اے علی! تم سات ممتاز صفات کے حامل ہو کہ جن کے بارے میں روز قیامت کوئی تم سے حجت بازی نہیں کرسکتا۔تم وہ پہلے شخص ہو جو خدا پر ایمان لائے اور خدائی پیمانوں کے زیادہ وفادار ہو اور فرمان خدا کی اطاعت میں تم زیادہ قیام کرنیوالے ہو''۔[1]

تحریف تاریخ

یہ امر لائق توجہ ہے کہ بعض لوگ ایسے بھی جو ایمان اور اسلام میں حضرت علی علیہ السلام کی سبقت کا سیدھے طریقے سے تو انکار نہیں کرسکے لیکن کچھ واضح البطلان علل کی بنیاد پر ایک اور طریقے سے انکار کی کوشش کی ہے یا اسے کم اہم بنا کر پیش کیا ہے بعض نے کوشش کی ہے ان کی جگہ حضرت ابوبکر کو پہلا مسلمان قرار دیں یہ لوگ کبھی کہتے ہیں کہ علی اس وقت دس سال کے تھے لہٰذا طبعاً نابالغ تھے اس بناء پر ان کا اسلام ایک بچے کے اسلام کی حیثیت سے دشمن کے مقابلے میں مسلمانوں کے محاذ کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔[2]

یہ بات واقعاً عجیب ہے اور حقیقت میں خود پیغمبر خدا پر اعتراض ہے کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ یوم الدار (دعوت ذی العشیرہ کے موقع پر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام اپنے قبیلے کے سامنے پیش کیا اور کسی نے حضرت علی علیہ السلام کے سوا اسے قبول نہ کیا اس وقت حضرت علی علیہ السلام کھڑے ہوگئے اور اسلام کا اعلان کیا تو آپ نے ان کے اسلام کو قبول کیا بلکہ یہاں تک اعلان کیا کہ تو میرا بھائی، میرا وصی اور میرا خلیفہ ہے۔

یہ وہ حدیث ہے جو شیعہ سنی حافظان حدیث نے کتب صحاح اور مسانید میں نقل کی ہے، اسی طرح کئی مؤرخین اسلام نے اسے نقل کیا ہے یہ نشاندہی کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کی اس کم سنی میں نہ صرف ان کا اسلام قبول کیا ہے بلکہ ان کا اپنے بھائی، وصی اور جانشین کی حیثیت سے تعارف بھی کروایا ہے۔[3]

کبھی کہتے ہیں کہ عورتوں میں پہلی مسلمان خدیجہ تھیں، مردوں میں پہلے مسلمان ابوبکر تھے اور بچوں میں پہلے مسلمان علی علیہ السلام تھے یوں دراصل وہ اس امر کی اہمیت کم کرنا چاہتے ہیں۔[4]

حالانکہ اول تو جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں حضرت علی علیہ السلام کی اہمیت اس وقت کی سن سے اس امر کی اہمیت کم نہیں ہوسکتی خصوصاً جب کہ قرآن حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں کہتا ہے: ''ہم نے اسے بچپن کے عالم میں حکم دیا''۔[5]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی ہے کہ وہ بچپن کے عالم میں بھی بول اٹھے اور افراد ان کے بارے میں شک کرتے تھے ان سے کہا: ''میں اللہ کا بندہ ہوں مجھے اس نے آسمانی کتاب دی اور مجھے نبی بنایا ہے''۔[6]

---

[1] الغدیر ہی میں یہ حدیث طبرانی اور بیہقی سے نقل کی گئی ہے نیز بیہقی نے مجمع میں، حافظ گنجی نے کفایہ اکمال میں اور کنز العمال میں نقل کی ہے۔

[2] الغدیر میں یہ حدیث حلیۃ الاولیاء ج ا ص 66 کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔

[3] یہ بات فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں سورہ توبہ آیت 100 کے ذیل میں ذکر کی ہے۔
یہ تعبیر مشہور اور متعصب مفسر مؤلف المنار نے بھی سورہ توبہ آیت 100 کے ذیل میں ذکر ہے۔

[4] یہ حدیث مختلف عبارات میں نقل ہوئی ہے اور جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اسے ابوجعفر اسکافی نے کتاب ''نہج العثمانیہ'' میں، برہان الدین نے ''نجبا الانبا'' میں، ابن اثیر نے کامل میں اور بعض دیگر علماء نے نقل کیا ہے (مزید وضاحت کے لئے الغدیر، عربی کی جلد دوم ص 278 تا 286 کی طرف رجوع کریں)

[5] سورہ مریم آیت 12

[6] سورہ مریم آیت 30

ایسی آیات کو اگر ہم مذکورہ حدیث سے ملا کر دیکھیں کہ جس میں آپ نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنا وصی، خلیفہ اور جانشین قرار دیا ہے تو واضح ہو جاتا ہے کہ صاحب المنار کی متعصّبانہ گفتگو کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ امر تاریخی لحاظ سے مسلم نہیں ہے کہ حضرت ابوبکر اسلام لانے والے تیسرے شخص تھے بلکہ تاریخ وحدیث کی بہت سی کتب میں ان سے پہلے بہت سے افراد کے اسلام قبول کرنے ذکر ہے۔ یہ بحث ہم اس نکتے پر ختم کرتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے خود اپنے ارشادات میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میں پہلا مومن، پہلا مسلمان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ پہلا نماز گذار ہوں اور اس سے آپ نے اپنے مقام وحیثیت کو واضح کیا ہے یہ بات آپ سے بہت سی کتب میں منقول ہے۔

علاوہ ازیں ابن ابی الحدید مشہور عالم ابوجعفر اسکافی معتزلی سے نقل کرتے ہیں کہ یہ جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ ابوبکر اسلام میں سبقت رکھتے تھے اگر یہ امر صحیح ہے تو پھر خود انھوں نے اس سے کسی مقام پر اپنی فضیلت کے لیے استدلال کیوں نہیں کیا اور نہ ہی ان کے حامی کسی صحابی نے ایسا دعویٰ کیا ہے۔[1]

دعوت ذوالعشیرۃ

تاریخ اسلام کی رو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بعثت کے تیسرے سال اس دعوت کا حکم ہوا کیونکہ اب تک آپ کی دعوت مخفی طور پر جاری تھی اور اس مدت میں بہت کم لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا، لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی "وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴿۲۱۴﴾"۔[2]

اور یہ آیت بھی "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ﴿۹۴﴾"۔[3] تو آپ کھلم کھلا دعوت دینے پر مامور ہو گئے اس کی ابتداء اپنے قریبی رشتہ داروں سے کرنے کا حکم ہوا۔

اس دعوت اور تبلیغ کی اجمالی کیفیت کچھ اس طرح سے ہے: آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو جناب ابوطالب علیہ السلام کے گھر میں دعوت دی اس میں تقریباً چالیس افراد شریک ہوئے آپ کے چچاؤں میں سے ابوطالب علیہ السلام، حمزہ علیہ السلام اور ابولہب نے بھی شرکت کی

کھانا کھا لینے کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا فریضہ ادا کرنے کا ارادہ فرمایا تو ابولہب نے بڑھ کر کچھ ایسی باتیں کیں جس سے سارا مجمع منتشر ہو گیا لہٰذا آپ نے انہیں کل کے کھانے کی دعوت دے دی۔

دوسرے دن کھانا کھانے کے بعد آپ نے ان سے فرمایا: ''اے عبدالمطلب کے بیٹو: پورے عرب میں مجھے کوئی ایسا شخص دکھائی نہیں دیتا جو اپنی قوم کے لیے مجھ سے بہتر چیز لایا ہو، میں تمہارے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی لے کر آیا ہوں اور خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ تمہیں اس دین کی دعوت دوں، تم میں سے کون ہے جو اس کام میں میرا ہاتھ بٹائے تاکہ وہ میرا بھائی، میرا وصی اور میرا جانشین ہو''؟ سب لوگ خاموش رہے سوائے علی بن ابی طالب علیہ السلام کے جو سب سے کم سن تھے، علی علیہ السلام اٹھے اور عرض کی: ''اے اللہ کے رسول اس راہ میں میں آپ کا یار و مددگار رہوں گا'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا ہاتھ علی علیہ السلام کی گردن پر رکھا اور فرمایا:

"ان ھذا اخی ووصی وخلیفتی فیکم فاسمعوا لہ واطیعوہ"۔

---

[1] الغدیر ج2 ص240

[2] سورہ شعراء آیت214

[3] سورہ حجر آیہ94

یہ (علی علیہ السلام) تمہارے درمیان میرا بھائی، میرا وصی اور میرا جانشین ہے اس کی باتوں کو سنو اور اس کے فرمان کی اطاعت کرو۔ یہ سن کر سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور تمسخر آمیز مسکراہٹ ان کے لبوں پر تھی، ابوطالب علیہ السلام سے کہنے لگے، ''اب تم اپنے بیٹے کی باتوں کو سنا کرو اور اس کے فرمان پر عمل کیا کرنا''۔ [1]

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان دنوں کس حد تک تنہا تھے اور لوگ آپ کی دعوت کے جواب میں کیسے کیسے تمسخر آمیز جملے کہا کرتے تھے اور علی علیہ السلام ان ابتدائی ایام میں جب کہ آپ بالکل تنہا تھے کیونکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدافع بن کر آپ کے شانہ بشانہ چل رہے تھے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت قریش کے ہر قبیلے کا نام لے لے کر انہیں بلایا اور انہیں جہنم کے عذاب سے ڈرایا، کبھی فرماتے:

''یابنی کعب انقذوا انفسکم من النار''۔

اے بنی کعب: خود کو جہنم سے بچاؤ، کبھی فرماتے: ''یا بنی عبدالشمس''، کبھی فرماتے: ''یا بنی عبدمناف''۔ کبھی فرماتے: ''یا بنی ہاشم''۔ کبھی فرماتے: ''یابنی عبد المطلب انقذوا انفسکم النار''۔ تم خود ہی اپنے آپ کو جہنم سے بچاؤ، ورنہ کفر کی صورت میں میں تمہارا دفاع نہیں کرسکوں گا۔

ایمان ابوطالب علیہ السلام

تمام علمائے شیعہ اور اہل سنت کے بعض بزرگ علماء مثلاً ''ابن ابی الحدید'' شارح نہج البلاغہ نے اور ''قسطلانی'' نے ارشاد الساری میں اور ''زینی دحلان'' نے سیرۂ حلبی کے حاشیہ میں حضرت ابوطالب علیہ السلام کو مومنین اہل اسلام میں سے بیان کیا ہے۔ اسلام کی بنیادی کتابوں کے منابع میں بھی ہمیں اس موضوع کے بہت سے شواہد ملتے ہیں کہ جن کے مطالعہ کے بعد ہم گہرے تعجب اور حیرت میں پڑ جاتے ہیں کہ حضرت ابوطالب علیہ السلام پر ایک گروہ کی طرف سے اس قسم کی بے جا تہمیں کیوں لگائی گئیں؟

جو شخص اپنے تمام وجود کے ساتھ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دفاع کیا کرتا تھا اور بارہا خود اپنے فرزند کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود مقدس کو بچانے کے لئے خطرات کے مواقع پر ڈھال بنا دیا کرتا تھا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس پر ایسی تہمت لگائی جائے۔

یہی سبب ہے کہ دقت نظر کے ساتھ تحقیق کرنے والوں نے یہ سمجھا ہے کہ حضرت ابوطالب علیہ السلام کے خلاف، مخالفت کی لہر ایک سیاسی ضرورت کی وجہ سے ہے جو ''شجرہ خبیثہ بنی امیّہ'' کی حضرت علی علیہ السلام کے مقام و مرتبہ کی مخالفت سے پیدا ہوئی ہے۔

کیونکہ یہ صرف حضرت ابوطالب علیہ السلام کی ذات ہی نہیں تھی کہ جو حضرت علی علیہ السلام کے قرب کی وجہ سے ایسے حملے کی زد میں آئی ہو، بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر وہ شخص جو تاریخ اسلام میں کسی طرح سے بھی امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے قربت رکھتا ہے ایسے ناجو اں مردانہ حملوں سے نہیں بچ سکا، حقیقت میں حضرت ابوطالب علیہ السلام کا کوئی گناہ نہیں تھا سوائے اس کے وہ حضرت علی علیہ السلام جیسے عظیم پیشوائے اسلام کے باپ تھے۔

---

[1] اس روایت کو بہت سے اہل سنت علماء نے نقل کیا ہے جن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں: ابن ابی جریر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، ابونعیم، بیہقی، ثعلبی اور طبری مؤرخ ابن اثیر نے یہ واقعہ اپنی کتاب ''کامل'' میں اور ''ابوالفداء'' نے اپنی تاریخ میں اور دوسرے بہت سے مؤرخین نے اپنی اپنی کتابوں میں اسے درج کیا ہے مزید آگاہی کے لئے کتاب ''المراجعات'' ص130 کے بعد سے اور کتاب ''احقاق الحق'' ج2، ص62 ملاحظہ فرمائیں۔